سمگلر

سمگلر

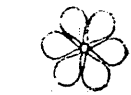

از

آر۔ بخت

ناشرین

ایم۔ آئی۔ کے ——— لاہور

۳۶ فیروز پور روڈ،

بار ——— بارہ

تعداد ——— پانچ سو

قیمت ——— دس روپے

سنہ ۱۹۹۶ء

جملہ حقوق بحق ایم۔آئی۔کے، لاہور محفوظ ہیں۔

مینیجر ایم۔آئی۔کے ۳۶ فیروز پور روڈ، لاہور نے رفاعی پرنٹرز، لاہور سے چھپوا کر شائع کیا۔

نوٹ

اِس کتاب کی کہانی، کردار اور مقامات قطعی فرضی ہیں۔ اگر کہیں کوئی مماثلت نظر آئے تو وہ اتفاقیہ ہوگی۔

ناشرین

پیش لفظ

اسلم کو جب یہ پتہ چلا کہ وہ سالانہ امتحان میں فیل ہو گیا ہے تو اپنی بہن کے طعنوں کی وجہ سے گھر سے بھاگ گیا۔

راستہ میں اُس کی ملاقات ایک ظاہرا ہمدرد مرد سے ہو جاتی ہے لیکن جلد ہی اُس کا ضمیر اُسے ملامت کرنے لگتا ہے کہ ایسے بُرے انسان کی صحبت میں رہنے سے تو بہتر یہ ہے کہ وہ اپنے گھر واپس چلا جائے۔ لیکن اُس مغرور، خود سر اور خود نما بہن کا رویہ اُس کے لئے ایک بڑی رکاوٹ ثابت ہوتا ہے۔

مری کے ہوٹل میں ایک ہمدرد دوست کی تجویز پر عمل پیرا ہو کر وہ ایک ایسا عظیم کارنامہ سرانجام دیتا ہے کہ اُس کی مغرور بہن بھی اُس پر فخر کرنے لگتی ہے اور اُسے گھر واپس آنے کی پُرزور دعوت دیتی ہے۔

مصنفہ کا یہ ایک اور قلمی شاہکار ہے جو نوجوانوں کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہوگا۔

اے۔ این۔ والٹر

باب ۱

لاہور کی بادشاہی مسجد کے قریب سے گذرتے ہوئے اسلم تیز تیز قدم اُٹھاتا راوی دریا کی طرف جا رہا تھا۔ اُس کی عمر یہی کوئی سولہ برس کے لگ بھگ تھی۔ قد لمبا اور جسم نرم و نازک تھا۔ چار بج چکے تھے۔ سڑک پر بڑی گہما گہمی تھی۔ سکولوں کے بچے، دفتروں اور کارخانوں میں کام کرنے والے اپنے اپنے گھروں کی طرف رواں دواں تھے کبھی کوئی موٹر ہارن بجاتی ہوئی تیزی سے اُس کے قریب سے گذر جاتی اور کبھی ایک شخص لمبے لمبے ڈگ بھرتا اُس سے بچ کر آگے بڑھ جاتا۔ ہر ایک اپنی ہی دھن میں کھویا ہوا تھا۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ سنجیدہ و سجیلا جوان اپنے گھر سے بھاگ رہا ہے۔ بھلا کسی اچھے کھاتے پیتے گھر کے بچے کے بارے میں کسے یہ خیال آسکتا ہے کہ وہ ایسی بھونڈی حرکت کرنے والا ہے۔

لمبی سانس کھینچتے ہوئے اسلم نے گھبراہٹ کے عالم میں اپنی پتلی پتلی انگلیوں سے اپنے سیاہ بالوں کو سنوارا۔ اُسے لمبے بال رکھنے کا بڑا شوق تھا۔

اب وہ راوی کے پل کو پار کر رہا تھا۔ دوسری طرف ذرا رُکا۔ مُڑ کر دُور تک سڑک پر نگاہ دوڑائی۔ اُس کی آنکھوں میں خوف کے آثار نظر آ رہے تھے۔ پریشانی کے عالم میں اس نے پھر خیال کیا کہ کیا اُس کے لئے گھر سے یوں بھاگ جانا درست ہے؟

اُسے ایسے معلوم ہو رہا تھا جیسے اُسکی ماں کی التجا بھری آنکھیں شروع سے ہی اُس کا تعاقب کر رہی ہیں۔ وہ زیرِ لب بڑبڑایا۔

"اُس بیچاری کو ابھی تک کچھ معلوم نہیں ہے۔ وہ تو یہی سوچ رہی ہو گی کہ آج رات میں خورشید کے گھر ہی ہوں گا"

مایوسی میں اُس نے اپنے بوٹ سے ایک پتھر کو ٹھوکر ماری۔ دھوکا دینے اور جھوٹ بولنے کی وجہ سے اُسے اپنے آپ پر رنج ہو رہا تھا۔

ٹن ٹن کرتی بیل گاڑیاں اُس کے قریب سے گذر رہی تھیں۔ کتنے اطمینان سے اُن میں کسان بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ انہیں کوئی فکر فاقہ نہ تھا۔ اسلم کو اُن پر رشک آنے لگا۔ اُس کے ذہن میں یہ سوال اُبھرا۔ "نوجوانوں کو اتنی مشکلات کا سامنا کیوں کرنا پڑ رہا ہے؟"

بعض اوقات مجھے یوں کیوں محسوس ہونے لگتا ہے کہ مجھ میں دو فطرتیں بسی ہوئی ہیں؟ ایک فطرت تو تابعداری کرنے کو اکساتی ہے لیکن دوسری ضدّی فطرت ہے جو ہر ایک کو غلط ثابت کرنا چاہتی ہے۔ ہائے!!! میں کیوں اِس ضدی اور باغی فطرت کے تابع ہو گیا ہوں؟"

اسلم کے والد کا موٹروں کی مرمت کرنے کا خاصا وسیع کاروبار تھا۔ اُسے اب یاد آیا کہ چند ہفتے پہلے اُس کی ایک معمولی سی حرکت سے اُس کے والد صاحب اُس سے کس قدر ناراض ہو گئے تھے۔ اسلم اپنے باپ کی بڑی عزت کرتا تھا، اگر اُن میں کمی تھی تو اِس بات کی تھی کہ وہ بڑے پرانے خیالات کے آدمی تھے۔ لیکن پھر بھی وہ اسلم کو بہت پیار کرتے تھے۔

چلتے چلتے وہ اپنے دل میں سوچ رہا تھا۔ "وہ مجھے زندگی میں ذرا سی عیش کیوں نہیں کرنے دیتے؟ بس اُن کی تو ہمیشہ یہی رٹ رہی ہے۔

پڑھو پڑھو اور بس پڑھتے ہی جاؤ۔ وہ میرا سارا خرچ اٹھاتے ہیں۔ اس لئے چاہتے ہیں کہ اُن کا بیٹا اچھے نمبر حاصل کرے اور وکیل بن جائے۔ ابّا جان یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ میں، اور میرے چار لنگوٹیے ذرا زندگی میں کچھ لطف تو اٹھالیں۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ میں تو پڑھتے پڑھتے مرمٹوں اور میرے چاروں دوست فلم دیکھ رہے ہوں یا دریا کے کنارے سیر کر رہے ہوں" اُس نے یہ مان لیا کہ شاید گذری دفعہ اُس نے واقعی بڑی لاپروائی کی تھی۔ میٹرک کا امتحان سر پر تھا لیکن اُس نے بالکل توجہ سے نہ پڑھا۔ کاش وہ چند دن دل لگا کر محنت کر لیتا۔ اب وہ اُس شرارت پر سوچنے لگا۔ جو چند ہفتے پہلے اچانک ہی اُس سے سرزد ہو گئی تھی۔

دو ہفتے گذرے، اُس کے والد کا ایک دوست اپنی نئی ٹیوٹا موٹر اُن کے ورکشاپ میں صفائی کرانے کے لئے لایا۔ آج کوئی جلدی نہ تھی اس لئے کہہ گیا کہ وہ کل صبح آکر موٹر لے جائے گا۔ اسلم نے یہ گفتگو سن لی تھی۔ دوپہر تک وہ موٹر ٹھیک ٹھاک کر دی گئی۔ اچانک ہی اُس کے دل میں خیال آیا کہ کیوں نہ اس نئی موٹر میں ذرا سیر تو کی جائے۔ شام بڑی سہانی تھی۔ بارش کے بعد ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ اُس کے ابّا اور امّی دو بجے اپنے گاؤں چلے گئے تھے کیونکہ انہیں کسی رشتہ دار کی بیماری کی اطلاع ملی تھی۔ شام ڈھلے تک اُن کے واپس آنے کی توقع نہ تھی۔ حیلے بہانے سے اسلم نے مستری سے اُس موٹر کی چابی لے لی اور وعدہ کیا کہ صرف بیس منٹ میں واپس آجائے گا۔ بس پھر کیا تھا۔ اب جو اسلم صاحب موٹر لے کر چلے تو وہ تو آسمان پر اڑنے لگے۔ انہیں وقت کا کوئی خیال ہی نہ رہا۔ پورے تین گھنٹے کے بعد ہی ورکشاپ کو واپس لوٹا۔

اچانک ہی موٹر کے مالک کو اطلاع ملی کہ اُس کا ایک نزدیکی رشتہ دار فوت ہو گیا ہے اور شام کو اُس کا جنازہ اٹھایا جائے گا۔ وہ بڑی تیزی سے اپنی موٹر لینے

گراج میں آیا لیکن وہاں اُس کی موٹر ہوتی تو اُسے ملتی۔ شام کو جب اسلم کے والد صاحب واپس آئے تو انہیں خوب ہی ڈانٹ پلائی گئی، اور بہت بُرا بھلا کہا گیا۔ آپے سے باہر ہوتے ہوئے ان کے والد نے کہا۔ "میں دیکھ رہا ہوں کہ اِن دنوں تو صرف وقت ضائع کر رہا ہے۔ ہر شام تیری یا تو سینما میں گزرتی ہے یا دوستوں کی پارٹیوں میں۔ سن لے کان کھول کر، اگر اس دفعہ تو دسویں جماعت کے امتحان میں پاس نہ ہوا تو میں تجھے کان سے پکڑ کر گھر سے باہر نکال دوں گا۔"

آج کسی کے ذریعہ سے اسلم کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ وہ دسویں جماعت کے امتحان میں فیل ہو گیا ہے۔

اِنہی خیالوں میں گم وہ آگے بڑھ رہا تھا اور بار بار یہی کہہ رہا تھا۔ "سب فضول ہے..... سب بکواس ہے۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔" اسی گھبراہٹ میں وہ کسی سے ٹکرا گیا۔ آنکھیں کھولیں تو اُس کے سامنے چونگی کا سپاہی کھڑا تھا۔

اسلم کی جان ہی تو نکل گئی۔ اُسے ایک دم یہ خیال آیا کہ اُسے پولیس والوں سے تو بہت ہی زیادہ بچ کے رہنا ہوگا۔ کل تک تو وہ اُس کی تلاش میں نکل کھڑے ہوں گے۔ لیکن اس وقت تو سر پر کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اس لئے اُس نے سپاہی کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا اور اپنی بے احتیاطی کی معافی چاہی۔

اب اندھیرا چھا رہا تھا۔ مارچ کا مہینہ تھا اس لئے سُورج غروب ہوتے ہی سردی بڑھنے لگی۔ ذرا دیر بعد ہر چیز نظر سے اوجھل ہو گئی اور چاروں طرف رات کی سیاہی پھیل گئی۔

کچھ دیر تک تو وہ اس کشمکش میں مبتلا رہا کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ اُس نے اس بات کا تو تہیہ کر لیا تھا کہ چاہے کچھ ہو جائے وہ اب واپس نہیں جائے گا۔ گھر کے سارے آدمیوں کے سامنے ذلیل ہونا اُس کی برداشت

سے باہر تھا۔ خاص کر اپنی بہن ثریا کے خیال سے تو وہ چڑ ہی گیا۔ ثریا شروع ہی سے بڑی مغرور لڑکی تھی اور ہمیشہ اپنی جماعت میں اوّل رہتی۔ اُس نے سارے امتحان بڑے اچھے نمبروں پر پاس کئے تھے اور اب ڈاکٹری پڑھ رہی تھی اس لئے وہ سب کی چہیتی تھی۔ سب اُسے بڑا پیار کرتے تھے۔ لیکن گھر میں اگر کوئی نظر بٹو تھا تو وہ صرف اسلم تھا۔

دل میں وہ بار بار دُہراتا "میں ہرگز ہرگز واپس نہیں جاؤں گا"۔ لیکن اُسے یہ خیال بھی ستا رہا تھا کہ اب جاؤں تو کہاں جاؤں۔

اُس نے اپنے کوٹ کے کالر کھڑے کر لئے۔ قمیض کی جیب میں ڈیڑھ سو روپیہ تھا۔ اُس نے خیال کیا کہ یہ کوئی بہت بڑی رقم تو ہے نہیں لیکن چند دن تو اُس سے گذارہ چل ہی جائے گا۔ اور تب تک شائد اُسے کوئی نوکری مل جائے گی۔ جب اسے یہ خیال آیا کہ یہ رقم اُس نے اپنی ماں کے بٹوے میں سے اڑائی ہے تو اُسے سخت دھچکا سا لگا۔ کیونکہ وہ اپنی ماں کی بڑی عزّت کرتا تھا۔ لیکن مرتا کیا نہ کرتا۔ اُسے یہ کرنا ہی پڑا تھا۔ اس کی ماں نے کسی کی شادی کا تحفہ خریدنے کے لئے یہ رقم رکھی ہوئی تھی۔

اب اُسے ایک اور خیال بھی آیا۔ وہ نیا حُلیہ کس طرح بدلے؟ ضرور ہے کہ اُس کے والد صاحب پولیس کو اُس کا مکمل ناک نقشہ دے دیں، اور یہ بھی بتا دیں کہ وہ کیا کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ اُس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کہ کہاں بھاگ جائے یا کہاں نوکری کرے۔ مستقبل اُسے تاریک اور ڈراؤنا دکھائی دے رہا تھا۔

گھر سے چلتے وقت اس نے ایک سویٹر، کمبل اور ایک چادر ساتھ لے لی تھی۔ سڑک پر ٹرکوں، بسوں اور موٹروں کی تعداد بھی بہت کم ہو گئی تھی۔

چادر باندھ کر وہ اپنی سویٹر پہن ہی رہا تھا کہ ایک لمبی سی سلیٹی رنگ کی موٹر اُس کے قریب آکر رُک گئی۔ کسی نے اندر سے پوچھا۔

"جانا چاہتے ہو؟"

"شکریہ۔ آپ کی عین نوازش ہوگی"۔ اسلم کی آواز میں خوف یا ڈر نہ تھا۔ موٹر والے نے دروازہ کھول دیا اور اُسے اشارہ کیا اور وہ اُس کے ساتھ ہی سامنے والی نشست پر بیٹھ گیا۔

"بڑی بڑی مہربانی۔ میں دل سے آپ کا شکر گذار ہوں"۔ وہ تھک کر چُور ہو رہا تھا اور شکریہ ادا کرتے ہی گدیلے جیسی نرم نشست میں دھنس سا گیا۔

موٹر تیزی سے چلنے لگی۔ ڈرائیور نے موٹر کے ریڈیو کا بٹن دبایا۔ کسی ریڈیو سٹیشن سے فلمی گیت سنائے جا رہے تھے۔ دونوں مسافر گیت سے لطف اندوز ہونے لگے۔

چند منٹ بعد اسلم نے ترچھی نظروں سے موٹر چلانے والے کی طرف دیکھا۔ وہ شخص بڑا معزز نظر آتا تھا۔ عمر اُس کی کوئی چالیس سال کے اوپر ہی ہوگی۔ اُس کے سر پر قیمتی پگڑی تھی اور ڈاڑھی خاصی گھنی تھی۔

اسلم نے دل ہی دل میں کہا۔

"معلوم تو یہ اچھا انسان ہوتا ہے۔ ڈاڑھی یہ ظاہر کرتی ہے۔ کہ وہ نماز روزہ کا ضرور پابند ہوگا۔ بول چال سے شریف اور پڑھا لکھا معلوم ہوتا ہے۔ وضع قطع سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ غیر ممالک میں بھی رہ چکا ہے۔ غیر مہذب اور اُجڈ بھی دکھائی نہیں دیتا"۔ اسلم کے دل میں اُس کے لئے بڑی عزّت پیدا ہوگئی اور اُس نے یہ اندازہ لگا لیا کہ وہ محض کسی کا ڈرائیور ہی نہیں ہے بلکہ اِس قیمتی موٹر کا خود مالک ہے۔

اسلم دل میں خوش ہو رہا تھا کہ موٹر والے نے اب اُس سے کوئی سوال نہ کیا تھا۔
"سونا ہے تو سو جاؤ۔" اسلم کو ایسے لگا جیسے بہت دور سے کوئی اُس سے کچھ کہہ رہا ہو۔ لیکن دوسرے ہی لمحے کسی نے اُس کا کندھا ہلایا تو وہ گھبرا کر بیدار ہو گیا۔

"بیٹا، تم نے ہمیں یہ تو بتایا ہی نہیں کہ تم جانا کہاں چاہتے ہو۔ اچھا ہے، ابھی بتا دو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم اپنی منزل سے آگے نکل جاؤ۔"

پہلے تو اسلم کو کچھ سمجھ ہی نہ آیا کہ وہ ہے کہاں یا کہے کیا۔ بمشکل تمام اتنا کہہ سکا "کیا کہا آپ نے؟"

دارا خان ہنسنے لگا۔ شک تو اُسے پہلے ہی ہو گیا تھا کہ دال میں ضرور کچھ کالا ہے۔ اسلم کے یوں گھبرانے سے اُسے یقین ہو گیا کہ ضرور کوئی بات ہے۔

"بیٹا تم جانا کہاں چاہتے ہو؟"

"مَیں .... مَیں .... مَیں اپنے چچا کے پاس جا رہا ہوں ..... راولپنڈی جا رہا ہوں۔" تُتلاتے ہوئے اُس نے بڑی مشکل سے یہ کہا۔

خان صاحب مشکل سے اپنی ہنسی روک سکا اور بڑے پُرسکون لہجہ میں یوں بولا۔

"تو پھر بیٹا آرام سے سو جاؤ۔ پنڈی تو ابھی بہت دور ہے۔"

نہ جانے کیوں اسلم کو اپنے بدن میں ایک سنسنی سی محسوس ہوئی۔ کہیں خان صاحب کو شک تو نہیں ہو گیا ہے؟ لیکن جب خان صاحب نے اُس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا کہ "بیٹا آرام کرو" تو اُس کا خوف جاتا رہا اور وہ جلد ہی گہری نیند سو گیا۔

لیکن اُدھر خان صاحب کا دماغ بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ یہ لڑکا تو عین وقت پہ قابو آ گیا۔ لیکن پہلے تو اسے یہ معلوم کرنا چاہیئے کہ یہ لڑکا ہے کون۔ گیت بجتے بجتے اچانک بند ہو گیا۔ اور ریڈیو پہ یہ اعلان کیا گیا۔

"اسلم۔ ولد محمد عبداللہ۔ مالک عبداللہ اینڈ سنز۔ موٹر ورکشاپ۔ عمر ۱۶ سال، رنگ صاف، قد لمبا۔ آج صبح سے لاپتہ ہے۔ دوپہر کو وہ شاہی مسجد کے قریب دیکھا گیا تھا۔ اُس وقت اُس نے نیلے رنگ کا کوٹ، گلابی قمیض اور نئی کھلے پائنچوں والی پتلون پہن رکھی تھی۔" خان صاحب نے بڑے غور سے اعلان سُنا۔

"ارے واہ۔ یہ سارا حلیہ تو بالکل اس لڑکے کا ہے۔" اُس نے سوتے ہوئے لڑکے کی طرف غور سے دیکھا اور مسکرا کر دل میں کہا۔ "قدرت مجھ پر کتنی مہربان ہے۔ مجھے بالکل ایسے ہی ایک لڑکے کی ضرورت تھی۔ اب میں اس سے اپنا کام نکلواؤں گا۔"

اچانک ذرا فاصلے پر سڑک کے درمیان سرخ روشنی نظر آئی۔ کوئی ٹارچ چمکا رہا تھا۔ "پولیس!!!" اُس نے ماتھے سے پسینہ پونچھا۔ لیکن ایک دم سمجھ گیا کہ کسی بیوقوف ڈرائیور نے ضرور اپنی بس ٹکرا دی ہے۔ اسلئے اُس نے اپنی موٹر آہستہ کر دی۔ اب وہ یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ وہ بڑا شریف انسان ہے۔ نزدیک آکر اُس نے دیکھا کہ سڑک کے بیچوں بیچ ایک ٹرک اُلٹ گیا ہے۔ خان صاحب نے اپنی موٹر کچے پر اتاری۔ جھٹکے لگنے سے اسلم نے ہڑبڑا کر اپنی آنکھیں کھول دیں اور باہر کی جانب دیکھا تو وہ عین اُسی وقت ٹرک کے پاس سے گذر رہے تھے۔ اُسی وقت ایک زوردار دھماکا ہوا اور خان صاحب نے ایک دم اپنی موٹر روک لی۔ ساتھ ہی موٹر کو ایک موٹی سی گالی دی۔ اُن کا اگلا پہیہ پنچر ہو گیا تھا۔

"یہ کیا مصیبت آگئی ہے؟" زور زور سے سانس لیتے ہوئے اُس نے کہا۔ "ابھی پولیس والا بھاگتا ہوا اِدھر آجائے گا۔ اسلم تم لیٹ جاؤ اور چادر اوڑھ لو۔ کہیں پولیس والا تمہیں پہچان نہ لے جلدی کرو جلدی۔"

گھبراہٹ میں اسلم کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے خان صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ کو میرے بارے میں کیسے پتہ چلا؟"

"ابھی ابھی ریڈیو پر تمہاری گمشدگی کا اعلان ہوا ہے، لیکن فکر نہ کرو۔ چادر اوڑھ لو۔"

سپاہی دوڑا ہوا آیا اور موٹر کے اندر جھانکتے ہوئے کہا۔ "کیا بات ہے؟ آگے کیوں نہیں بڑھتے؟"

خان صاحب نے ہاتھ ملتے ہوئے مسکرا کر سپاہی کی طرف دیکھا اور بولا۔

"ہائے قسمت۔ موٹر پنکچر ہو گیا ہے۔"

سپاہی نے زور زور سے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"موٹر اُس طرف کرو۔ پہلے ہی راستہ رُکا ہوا ہے۔ اگر موٹر یہاں کھڑی رہی تو نہ کوئی آسکے گا نہ جاسکے گا۔"

اتنے میں ایک اور سپاہی بھی وہاں آگیا۔ دونوں نے مل کر موٹر کو دھکا لگانا شروع کیا اور سڑک کے دوسری طرف کوئی پچاس فٹ آگے لے آئے۔ خان صاحب نے موٹر کی بتیاں بجھائی ہوئی تھیں۔ جب موٹر رکی تو وہ جلدی سے باہر آیا۔ سپاہیوں کا شکریہ ادا کیا۔

ایک سپاہی نے پہیہ بدلنے میں مدد دینے کو کہا تو خان صاحب بولے۔ "توبہ توبہ۔ بھلا آپ کیوں اپنے ہاتھ گندے کریں!

یہ کوئی مشکل بات تو ہے نہیں۔ آپ بالکل فکر نہ کریں۔"

سپاہیوں کے چلے جانے کے بعد اسلم نے خان صاحب کی مدد کرنے کو کہا۔

"ابھی خاموشی سے بیٹھے رہو۔ انہیں دور چلا جانے دو۔ جب میں کہوں تب

باہر آنا۔" دروازہ کھول کر خان صاحب موٹر کی پچھلی طرف گئے اور ڈگی کھولی۔ اسلم بھی دوسری طرف کا دروازہ کھول کر اُس وقت تک ڈگی تک آ پہنچا تھا۔ خان صاحب نے فالتو پہیہ نکالنے کو اِدھر اُدھر ہاتھ مارا لیکن اُسے پہیہ نہ ملا تو اُس نے ایک سیکنڈ کے لئے اپنی ٹارچ روشن کی۔ ڈگی میں جو کچھ پڑا تھا اُسے دیکھ کر تو اسلم کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ ڈگی میں بوتلیں ہی بوتلیں۔ بوتلیں ہی بوتلیں بھری پڑی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ خان صاحب پولیس والوں سے کوئی مدد نہ لینا چاہتے تھے۔

"اسلم۔ تم کیوں میری اجازت کے بغیر موٹر سے باہر آئے؟"

لیکن یکلخت اپنے پر قابو پاتے ہوئے اُس نے لڑکے کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر کہا۔

"بیٹا۔ بالکل فکر نہ کرو۔ میں تمہارا سب طرح سے خیال رکھوں گا۔" بار بار گھوم کر وہ اُس طرف دیکھتا جدھر سپاہی کھڑے تھے۔ ڈگی سے پہیہ نکال کر اُسے جلدی سے بند کر دیا۔ وہ یہ چاہتا تھا کہ ضرورت سے زیادہ وہ ایک سیکنڈ بھی یہاں نہ ٹھہریں۔ "آؤ۔ جلدی جلدی پہیہ بدل لیں۔"

اسلم نے اوزار پکڑتے ہوئے کہا۔

"خان صاحب، یہ مجھے دے دیں میں پہیہ بدل دیتا ہوں۔"

اسلم اس قسم کے کاموں سے بخوبی واقف تھا۔ پلک جھپکنے میں اُس نے پہیہ بدل ڈالا۔ خان صاحب اُس کے کام سے دل میں بہت خوش ہو رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔

"جس طرح ریڈیو پر اعلان ہوا تھا کہ یہ دسویں جماعت میں فیل ہو گیا ہے تو پھر کیا ہوا۔ بھلا اس طرح فیل ہو جانے سے اس ہوشیار لڑکے کی زندگی تھوڑے ہی تباہ ہو جائے گی۔"

اسلم کے ماہر ہاتھوں نے کام ختم کر لیا تھا۔ انہیں پولیس کی موجودگی کا بھی احساس تھا اس لئے انہوں نے وہاں سے روانہ ہونے میں ذرا بھی دیر کرنی مناسب نہ جانی۔

"تم تو بڑے کام کے بندے ہو" خوشی سے دارا نے اسلم کی پیٹھ ٹھونکی اور موٹر پکی سڑک پر تیزی سے چلنے لگی۔

اسلم اب نیند سے بیدار ہو چکا تھا۔ اُس کے ذہن میں خیال بڑی تیزی سے چکر لگانے لگا۔ "یہ آدمی کون ہے؟ کہیں کوئی خطرناک انسان تو نہیں ہے؟ مجھے اِس سے بھاگ جانا تو نہیں چاہیئے؟ تو یوں گھر سے بھاگ جانے میں کیا میں نے بیوقوفی نہیں کی ہے؟"

اسلم گم سم بیٹھا خلا میں گھور رہا تھا۔ پھر خان صاحب نے بڑے ہمدردانہ لہجہ میں خاموشی کو توڑا۔ "بیٹا۔ اپنے ماں باپ کا فکر نہ کرو۔ اب اپنے ہی پاؤں پر کھڑے ہو جاؤ۔ آج کل کے زمانہ میں ہونہار جوان بچے دیر تک ماں باپ کے سہارے نہیں رہتے۔"

لیکن اسلم پھر بھی سوچ رہا تھا کہ یوں گھر سے بھاگ نکلنا کونسی عقلمندی ہے؟ نہ ہی میں زیادہ پڑھا لکھا ہوں اور نہ ہی کوئی ہنر جانتا ہوں پھر میں کونسی نوکری کروں گا؟ یا کس طرح روپیہ پیسے کمانوں گا؟ بڑی فکر سے اُس نے کہا۔

"خان صاحب، سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کر سکتا ہوں!"

دارا نے سگریٹ سلگا کر اپنے ہونٹوں سے لگایا اور دو چار گہرے کش لگا کر بولا۔

"اگر ایسی ہی بات ہے تو پھر میرے پاس نوکری کیوں نہیں کر لیتے؟ لیکن اگر میری نوکری کرنا منظور ہے تو اسے خفیہ رکھنا ہوگا۔"

اسلم سوچنے لگا کہ خان صاحب کیا کام کرتے ہوں گے اور وہ اُسے کس قسم کی نوکری پر لگائیں گے ؟ موٹر کی ڈگی میں اُس نے بوتلیں دیکھی تھیں ۔ کیا خان صاحب سمگلنگ کا دھندا کرتا ہے ؟ اسلم نے خان صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "یہ کام میں نہیں کر سکتا خان صاحب ۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ میں نے اس قسم کا کام پہلے کبھی نہیں کیا ہے اور نہ ہی میں یہ کرنا جانتا ہوں"۔

خان صاحب کھلکھلا کر ہنس دیا اور زور سے اُس کی پیٹھ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا ۔ "میں جتنی زیادہ تمہاری باتیں سنتا ہوں اتنا ہی مجھے کامل یقین ہوتا جاتا ہے کہ مستقبل میں تم ایک نہایت ہی اعلےٰ کارکن ثابت ہوگے ۔ میں کوئی بُرا کام تھوڑا ہی کرتا ہوں ؟ میرا کام بڑے اونچے درجہ کا ہے میں تو سرکاری ملازم ہوں"۔

لیکن اسلم اپنا شک دور کرنا چاہتا تھا اور پھر اُس نے وہ بوتلیں بھی دیکھ لی تھیں ۔ اُس نے دبے الفاظ میں پوچھا ۔

"خان صاحب ۔ وہ بوتلیں آپ نے ڈگی میں کیوں چھپا کر رکھی ہوئی ہیں"؟

باب ۲

نہر کے کنارے والی سڑک پر آمد و رفت بالکل بند ہو چکی تھی۔ ہر طرف مکمل خاموشی تھی۔ ایسے معلوم دیتا تھا جیسے ہر شے گہری نیند سوئی پڑی ہے۔ لیکن عبداللہ صاحب کے مکان کی اب تک ساری بتیاں روشن تھیں۔ شائد وہاں کسی دعوت کا اہتمام ہے۔ برآمدے میں تین موٹریں کھڑی تھیں۔ ایک موٹر نواسلم کے والد کی تھی، دوسری اُس کے ماموں کی اور تیسری پولیس کی موٹر معلوم ہوتی تھی۔

ہوا کے جھونکے سے گول کمرے کے پردے ہلنے لگے اور کمرہ تازہ پھولوں کی خوشبو سے مہک گیا۔ لیکن کمرے میں بیٹھنے والے اِس خوشبو سے بے خبر تھے۔ اسلم کی ماں صوفے کے کونے میں دُھنسی بیٹھی تھیں۔ وہ چالیس کے لگ بھگ ہوں گی لیکن اب بھی معلوم ہوتا تھا کہ جوانی میں وہ کس قدر خوبصورت تھیں۔ وہ رومال سے بار بار اپنی آنکھیں پونچھتیں۔ اُن کی موٹی موٹی آنکھیں رو رو کر سرخ ہو رہی تھیں اور سُوجی ہوئی بھی تھیں۔ بوڑھی آیا شریفہ بی بی اُس کے قریب ہی کھڑی تھی اور اُسے تسلی دینے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ بھی اِس وقت بڑی دبلی اور مریل سی نظر آ رہی تھی۔ بار بار اپنے میلے سے دوپٹے

کے کنارے سے اپنے آنسو پونچھے۔ اُسے تو ایسے لگ رہا تھا جیسے اُس کا پوتا فوت ہو گیا ہے۔

اسلم کے والد آرام کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ آنکھیں تو اُن کی بھی آنسوؤں میں ڈبڈبا رہی تھیں لیکن وہ اپنے آپ کو پوری قوت سے قابو میں رکھے خاموشی سے بیٹھے ہوئے تھے۔

تھانیدار نہایت خاموش اور سنجیدہ نظر آرہا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک کاپی اور پنسل تھی۔ وہ اسلم کے ماموں اور اُس کے بیٹے خورشید کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ ہونٹوں میں پنسل دباتے ہوئے اُس نے کہا۔ "آپ ہماری بڑی مدد کر سکتے ہیں۔ مہربانی سے مجھے یہ بتائیں کہ جس دن اسلم آپ کے ساتھ تھا اُس نے آپ سے کیا کیا باتیں کیں اور وہ کہاں کہاں گیا۔ یہ درست ہے نا کہ غائب ہونے سے پہلے آپ ہی آخری شخص ہیں جن سے ملا ہے؟"

اسلم کے ماموں نے گلا صاف کرتے ہوئے سر ہلا کر جواب دیا۔ "مجھے اُس میں کوئی خاص بات تو نظر نہ آئی تھی۔ وہ بالکل پریشان دکھائی نہ دیتا تھا۔ جب اُسے یہ پتہ چل گیا کہ وہ امتحان میں فیل ہو گیا ہے تو اُس نے کوئی بھی غیر معمولی حرکت نہ کی تھی۔ کیوں ٹھیک ہے نا خورشید؟" اسلم کے ماموں نے سگریٹ کے بقایا حصہ کو آتش دان میں پھینکتے ہوئے کہا۔ "خورشید اب تم اپنی بات بتاؤ۔"

خورشید جس کی عمر کوئی سولہ سال کی تھی۔ لمبی سانس لے کر کچھ سوچنے کی کوشش کی لیکن وہ کچھ کہہ نہ سکا۔ اپنے ہاتھوں کو رومال سے پونچھتے ہوئے اُس نے بڑی مشکل سے یہ الفاظ کہے۔

"جی۔۔۔۔ میں نے جو کچھ کہنا تھا، وہ میں سب کہہ چکا ہوں۔"

اب خود اسلم کے والد سے رہا نہ گیا۔ وہ کود کر کھڑے ہو گئے اور کمرے میں اِدھر اُدھر ٹہلنے لگے۔ اسلم کی ماں کے رونے کی آواز خاموشی کو توڑ رہی تھی۔ صرف پولیس افسر ہی بڑے تحمل سے اپنی جگہ بیٹھا ہوا تھا۔

افسر نے خورشید اور اسلم کے ماموں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "مہربانی سے اپنے بیان کو ایک مرتبہ پھر دُہرائیں تاکہ میں سب روداد اپنی کاپی میں لکھ لوں۔"

ماموں نے اپنا سر کرسی کی پشت پر ٹکا کر اپنا بیان شروع کیا۔ "بات یوں ہوئی۔ جب لڑکوں کے سالانہ امتحان ختم ہو چکے تھے، تو اسلم ہمارے ہاں آیا۔ اُس کا ارادہ تھا کہ وہ سارا دن ہمارے ہاں ہی رہے گا۔ اسلم کے کہنے پر میں نے اپنے ایک دوست کی معرفت ان کے امتحان کا نتیجہ معلوم کر لیا تھا۔ جب اسلم کو یہ خبر سنائی گئی کہ وہ امتحان میں رہ گیا ہے تو اُس نے کوئی غیر معمولی حرکت نہ کی۔ جب ہم دوپہر کو روٹی کھا رہے تھے تو معمول کے مطابق وہ ہنس بھی رہا تھا اور بول بھی رہا تھا۔ کھانے کے بعد میں تو دفتر چلا گیا۔ یہ ہے اُس دن کی مکمل رُوداد۔"

تھانیدار تیزی تیزی سے ماموں کا سارا بیان اپنی کاپی میں لکھ رہا تھا۔ پھر خورشید کی طرف دیکھ کر کہا۔ "بیٹا، اب تم بتاؤ۔ صرف تم ہی ہمیں ساری بات بتا سکتے ہو کیونکہ بھاگ جانے سے پہلے اسلم تمہارے ساتھ تھا۔"

خورشید گہری سوچ میں پڑ گیا۔ اُس نے اپنی پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈال لیے اور سامنے دیوار کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ پھر جیب سے رومال نکال کر منہ صاف کیا اور بولا۔

"جناب میں نے بڑے خیال سے آپ کو ہر بات بتا دی ہے اور اب

پھر دُہراتا ہوں کہ کھانا کھانے کے بعد میں نے اسلم سے کہا کہ آؤ بازار چلیں۔ مجھے بازار سے چند چیزیں خریدنی تھیں۔ میں نے اُس سے یہ بھی کہا کہ ہم اپنی ہاکیاں بھی ساتھ لے لیتے ہیں۔ بازار کے بعد ہم سیدھے باغ میں چلے جائیں گے اور وہاں ہاکی کھیلیں گے۔" لیکن اسلم میری بات نہ مانا۔ وہ آرام کرنا چاہتا تھا اور جو کہانی وہ پڑھ رہا تھا اُسے ختم کرنا چاہتا تھا۔"

خورشید نے اپنے پھیلے ہوئے لمبے لمبے پاؤں سکیڑ لیے۔ کرسی پر سیدھا ہو کر بیٹھا اور پھر بولا۔

"میں اسلم کی عادت کو اچھی طرح جانتا ہوں اس لئے میں اُس سے ذرا ناراض ہو کر بولا۔ "یار یہ کیا بات ہوئی؟ اگر سونا ہی ہے تو رات کو بھی سو سکتے ہو۔ یہ کیا منحوسیت دکھا رہے ہو؟"

تھانیدار نے اپنی پنسل کو کاپی پر آہستہ آہستہ مارتے ہوئے کہا۔ "کیا تم نے اُس وقت یہ محسوس کیا کہ اسلم کے ذہن میں کوئی بات ہے؟ کیا اُس نے کوئی ایسی بات کی کہ اب اُس کا باپ اُسے سخت سُست کہے گا؟ یا گھر سے بھاگ جانے کا کوئی اشارہ کیا؟"

"نہیں نہیں، بالکل نہیں۔ میں تو صرف یہ سوچ رہا تھا کہ اُس کا دماغ چل گیا ہے، یا وہ سونا چاہتا ہے۔ اس لئے میں اُسے چھوڑ کر بازار چلا گیا۔"

اسلم کے والد تھانیدار کے سامنے رک گئے اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"اُسے بھلا ڈر کس بات کا ہو سکتا تھا؟ امتحانوں سے پہلے وہ اپنی پڑھائی لکھائی پر بالکل دھیان نہیں دے رہا تھا اس لئے ایک دن میں نے اُسے ڈانٹا اور منت کر کے کہا کہ "بیٹا ان دنوں تو ذرا دھیان سے پڑھو۔ یقیناً اُس کے گھر سے بھاگ جانے کی ہرگز وجہ نہیں ہو سکتی۔"

سسکیوں کے درمیان اُس کی والدہ بولیں ۔" میں نے بھی بڑی عاجزی سے اُس سے کہا تھا کہ "بیٹا نماز پڑھنا کبھی نہ بھولنا۔ وہ اس بات سے بھی بہت کتراتا تھا میرا خیال ہے صرف بقرعید کے موقع پر ہی اُس نے نماز پڑھی تھی ۔" تھانیدار یہ سن کر قدرے مسکرا دیا ۔

اچانک ہی خورشید کو ایک بات یاد آئی کہ جب اسلم کے والد نے اُسے دھمکی دی تھی تو اُس نے اُس سے کچھ کہا تھا ۔ اُس کے تن بدن میں گویا چنگاریاں اُٹھنے لگیں ۔ بار بار وہ دل میں کہتا ۔

" میں وہ بات بتاؤں یا نہ بتاؤں ؟"

عین اُسی وقت ایک ٹیکسی بڑے پھاٹک سے اندر داخل ہوئی ۔ رات کی خاموشی میں جب پہیے بجری پر چل رہے تھے تو کتنا شور سا سنائی دے رہا تھا ۔ پھر زور سے ٹیکسی کا دروازہ بند ہونے کی آواز آئی اور کسی لڑکی کی ٹیکسی ڈرائیور سے لڑنے کی اونچی اونچی آواز سنائی دی ۔ پھر جوتیوں کے کھٹ کھٹ چلنے کی آواز کے ساتھ ہی وہ اونچی آواز میں بولی ۔" سب کہاں چلے گئے ہیں ؟" کھٹ کھٹ کرتی وہ بیٹھک کے دروازے کی طرف بڑھی ۔

تھانیدار نے رومال سے منہ پونچھتے ہوئے دل ہی دل میں خیال کیا " توبہ، کیسی کرخت آواز ۔ گفتگو سے تو ایسا معلوم دیتا ہے گویا کوئی فلم ایکٹریس اپنا پارٹ ادا کر رہی ہے ۔"

" ثریا " اسلم کی والدہ کی زبان پر بے اختیار یہ لفظ آگیا اور اُس نے منہ بسور کر سسکنا شروع کر دیا ۔

جب اسلم کی بہن ثریا اندر کمرے میں داخل ہوئی تو سب آنکھیں اُس ہی طرف اُٹھ گئیں ۔ تھانیدار کو اُسے دیکھ کر بڑی ہی حیرت ہوئی ۔ وہ دل

میں کہنے لگا۔ "اتنی پیاری لڑکی اور اتنی بھونڈی آواز!!!"
ثریا کا درمیانہ سا قد تھا آنکھوں سے بڑی ہوشیار چالاک نظر پڑتی تھی۔ پہلی نظر دیکھتے ہی لوگ اُس کی طرف غور سے دیکھنے پر مجبور سے ہو جاتے تھے۔ کاش وہ اپنے آپ کو اپنے اصلی روپ میں پیش کیا کرتی لیکن وہ تو ہمیشہ اپنے کو کچھ اور ہی ظاہر کرتی تھی۔ اُس کی طبیعت میں کینگی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور ہر ایک پر رعب جماتی تھی۔ ساتھ ہی وہ پرلے درجے کی خود غرض تھی اُس کی والدہ ان سب عیبوں سے چشم پوشی کر لیتی تھیں۔ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتی تھیں کہ ثریا کی طبیعت میں جو اس قدر چڑچڑا پن ہے وہ صرف اس وجہ سے ہے کہ ہسپتال میں وہ ہمیشہ دکھ درد اور مریضوں کے درمیان رہتی ہے اس لئے اُس کی ذہنیت اس قسم کی ہو گئی ہے۔
ثریا کو احساس ہو رہا تھا کہ سب اُس کی طرف دیکھ رہے ہیں اس لئے وہ اونچی ہواؤں میں اڑنے لگی۔ ابھی بھی اُس نے ہسپتال والا سفید ڈاکٹری کوٹ پہنا ہوا تھا۔ بڑے بناوٹی انداز میں اُس نے اپنے ہاتھ اوپر اٹھائے اور اوپری سی مصنوعی آواز میں بولی۔ "ممی جی ..... ابّو جی .... مجھے آپ کے فون سے سب کچھ پتہ چل گیا۔ لیکن میں جلدی نہ آسکی۔ کیا اسلم نے واقعی یہ حرکت کی ہے؟" ہاتھ پھیلائے وہ اپنی والدہ کی طرف لپکی اور دونوں نے گلے لگ کر ڈھاڑیں مارنی شروع کر دیں۔
چند منٹ بعد وہ اپنی ماں سے علیحدہ ہوئی اور تھانیدار کے سامنے سے گذرتی ہوئی اپنے والد کے پاس آکھڑی ہوئی۔ اُس کا ایک ہاتھ سفید کوٹ کی جیب میں تھا اور دوسرے کو تیزی سے ہوا میں لہراتی ہوئی اونچی آواز میں چلا کر بولی "یہ ہیں آپ کے چہیتے کے لچھن!! دیکھ لیں! اُسے اپنے گھر کی عزت کا کتنا خیال ہے! ذلیلوں کی طرح گھر سے بھاگ گیا ہے۔"
والد نے ایک دم اُس کی بات کاٹی "شاید اُسے کوئی اغوا کر کے لے گیا ہے۔

ابھی تک اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملا کہ وہ بھاگ گیا ہے۔"

"اغوا ہو؟" ثریا نے اپنی آنکھوں کو مٹکاتے ہوئے چاروں طرف دیکھا "بھلا اُس ڈھینگ کو کون اغوا کرے گا؟ اِس فضول انسان کو!"

رومال کے کونے سے اُس نے اپنی آنکھ سے سرمہ کو ٹھیک کیا۔ اُسی وقت اُسے تھانیدار کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اُسے مخاطب کرتے ہوئے اُسی کرخت لہجہ میں بولی۔ "آپ اندازہ بھی نہیں کر سکتے کہ ان دنوں وہ کس قدر سست اور کاہل ہو گیا تھا۔ اُسے پاس ہونے یا اچھے نمبر حاصل کرنے سے تو کوئی غرض ہی نہ تھی۔"

تھانیدار کے دماغ میں یہ خیال چکّر لگانے لگا۔

"کسی اور کی وجہ سے تو ہو یا نہ ہو لیکن اِس شیطان کی خالہ کی وجہ سے تو ضرور اسلم اپنے گھر سے بھاگ سکتا ہے۔" اُس نے ثریا سے پوچھا۔

"کیا آپ میں اور آپ کے بھائی میں کوئی ناانفاقی تو نہ تھی؟"

ثریا نے سر کو جھٹکا دے کر کہا۔ "نہیں تو کوئی بھی نہیں۔" اور خورشید کی طرف قہر آلود نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "اس وقت کے ان فضول چھوکروں کو وقت ضائع کرتے میں دیکھ نہیں سکتی۔ خیر یہ تو اور بات ہے۔ لیکن ہم میں کوئی جھگڑا نہ تھا۔"

"یاد کریں کہ آپ نے اپنے بھائی سے کوئی بات کی، یا اُس نے فون یا کسی اور ذریعہ سے آپ تک کوئی پیغام پہنچایا ہو؟" تھانیدار کی پنسل کاپی کے صفحہ پر تیزی سے چل رہی تھی۔

"معاف کیجئے گا، اِس معاملہ میں میں آپ کی ذرا بھر مدد نہ کر سکوں گی۔ کیونکہ آخری بار جب میں گھر آئی تھی اور اُس فضول انسان کو دیکھا تھا، اُسے پورا ایک ہفتہ گذر چکا ہے۔" ثریا نے اپنے رومال کو زور سے ہوا میں جھٹکا۔

تھانیدار نے ثریا کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"بہت بہتر۔ بہت بہتر" پھر چاروں طرف دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا "ہم سے جو کچھ بھی ہو سکا کریں گے۔ ہماری پوری کوشش ہوگی کہ اسلم جلد از جلد واپس گھر پہنچ جائے"

اسلم کے والد تھانیدار کو باہر تک چھوڑنے آئے۔ برآمدے میں جب تھانیدار اُن سے رخصت ہو رہا تھا تو ثریا اور اُس کی والدہ نے اس کے یہ الفاظ سُنے۔

"ریڈیو..... اخبار..... پیسے نہیں ہیں تو جلد واپس آجائے گا"

"ہاں ماں جی" ثریا بڑی حقارت سے بولی۔ "جیب میں تو نواب صاحب کی ایک کوڑی نہیں۔ بھوکا مرے گا تو خود ہی منحوس صورت لئے آجائے گا"

رومال میں اُس نے اپنی ناک صاف کی اور آنکھیں پونچھیں۔ اُس کی طبیعت بڑی بھاری ہو رہی تھی اور وہ پریشان بھی تھی۔ لیکن پھر بھی اپنے بھائی اسلم کے لئے اُس کے دل میں کوئی ترس نہ تھا۔

اپنی خود غرض بناوٹی اور مغرور فطرت کے باعث وہ مجبور تھی کہ مایوسی کو اپنے پاس نہ پھٹکنے دے۔ شاید اسی وجہ سے اُس کا چھوٹا بھائی مجبور ہو کر گھر سے نکل گیا تھا۔ اُسے اس بات کی بھی بالکل پرواہ نہ تھی کہ شاید کوئی ظالم اُس کے بھائی کو قتل کر دے یا اکیلا ہو، مایوسی سے دل برداشتہ ہو کر خودکشی کرے۔ اُسے ان باتوں سے کیا سروکار؟ اُس کا نظریہ تو یہ تھا کہ زندگی میں دُکھ درد، مایوسی پریشانی انسان کی اپنی پیدا کی ہوئی ہوتی ہیں۔ ہر انسان اپنے قول و فعل کا خود ذمہ دار ہے۔ اسلم کیوں گھر سے بھاگا ہے؟ یہ اُس کا ذاتی فعل ہے۔ کسی کو اس سے کیا!

ثریا کی ماں نے بڑی حسرت بھری نظروں سے اُس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"کاش بیٹی، اپنے بھائی کے لئے تم اتنی سنگدل نہ ہوتی۔ تمہیں تو اُس کا ذرا بھر خیال نہیں"

"خیال نہیں ہے" رومال کو اپنی انگلیوں میں مروڑتے ہوئے وہ چیخ کر بولی۔ "مجھے ضرور خیال ہے۔ میں کوئی لکڑی یا پتھر کا مجسمہ تھوڑے ہی ہوں۔ لیکن امی جی آپ یہ نہ بھولیں کہ موجودہ دور کی نسل پچھلی نسل سے بالکل مختلف ہے۔ آج کل کے نوجوان ایسے گھٹیا احساسات کے مالک نہیں ہیں۔ ماں جی۔ کیا آج تک میری یہی کوشش نہیں رہی ہے کہ ہر امتحان میں میں اوّل آؤں تاکہ ہمارے خاندان کا نام روشن ہو؟ کیا آج تک میں نے اپنے ابّو کی ہر بات کو نہیں مانا ہے؟"

"ہاں۔ میری بیٹی تم ٹھیک کہتی ہو۔ مہربانی سے میری باتوں کا بُرا نہ مناؤ۔"

خورشید خاموش بیٹھا ثریا کی طرف دیکھتا رہا۔ اُس کے دل میں یہی خیال تھا کہ ثریا اپنے بھائی کے حق میں کتنی بُری ہے۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ ثریا کی باتوں میں کوئی گہرائی نہیں ہے۔ مانا کہ موجودہ وقت کے نوجوان بالکل فرق طبیعت رکھتے ہیں۔ لیکن اُن کے دلوں میں احساس ضرور ہے۔

تھانیدار کو رخصت کر کے اسلم کے ابّا اور ماموں واپس آ رہے تھے۔ خورشید نے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ جب وہ کرسیوں پر بیٹھ گئے تو اُس نے یہ مناسب سمجھا کہ ثریا کی موجودگی میں ہی وہ اپنے دل کی بات انہیں بتا دے۔ جسے چھپانے کی وہ اب تک کوشش کر رہا تھا۔ رکتے رکتے وہ یوں بولا۔

"ماموں جان۔ اگر مجھے اجازت ہو، تو میں ایک بات بتاؤں؟ شاید اس سے ہمیں اِس معاملہ کو سمجھنے میں کچھ مدد ملے۔"

اسلم کے والد کی آنکھیں خورشید پر جیسے جم سی گئیں۔ کپکپاتی ہوئی آواز میں وہ بولے۔ "ضرور بیٹا۔ جو کچھ تم جانتے ہو، بے خوف ہمیں بتاؤ۔"

خورشید نے مختصر طور پر اُس دن کا قصہ دہرایا جب کسی گاہک کی نئی موٹر اسلم لے گیا تھا۔ اور اُس دن جو بات انہوں نے اسلم کو کہی تھی وہ بھی بیان کی۔

اُس وقت مسٹر عبداللہ کی حالت ایسے ہوگئی، جیسے کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔
"میں نے یہ کہا تو ضرور تھا۔ لیکن میرا یہ مطلب تو ہرگز ہرگز نہیں تھا کہ میں واقعی اُسے گھر سے نکال دوں گا۔ یقیناً اس وجہ سے وہ ڈر کر گھر سے بھاگ نہیں سکتا۔" گہری سانس لے کر وہ بولے۔ "توبہ بابا! موجودہ دور کے جوانوں کی طبیعت کو سمجھنا کتنا مشکل ہے"؟

خورشید نے سر ہلا کر کہا۔ "ماموں جان۔ ہم نوجوانوں کے لئے بھی اس نئے دور میں زندگی بسر کرنا مشکل ہوگیا۔ کبھی ہمیں نئی طرز کے بال بڑھانے کی وجہ سے بُرا بھلا کہا جاتا ہے۔ کبھی ٹیڈی پتلون یا بیل باٹم پہننے پر ہمیں باتیں سننا پڑتی ہیں۔ اب آپ ہی بتائیں کہ ہم کیا کریں؟ اگر ہم وقت کے ساتھ ساتھ نہ چلیں تو ہمارے دوست ہمارا مذاق اڑاتے ہیں اور اگر فیشن کے مطابق چلیں تو ہمارے والدین ہماری دُرگت بناتے ہیں۔ اب ہم بچارے کہاں چلے جائیں"۔

مسٹر عبداللہ نے اپنی عینک درست کی اور خورشید کی طرف منہ کر کے کہا۔ "یہ حقیقت ہے کہ موجودہ وقت کا تقاضا کچھ ایسا ہی ہے۔ لیکن میں نے اسکم کو کون سی گولی مار دی تھی۔ میں نے تو اُسے صرف اتنا کہا تھا کہ وہ وقت ضائع نہ کرے۔ دل لگا کر پڑھے کیونکہ امتحان سر پر تھا۔ اِس سے زیادہ تو میں نے کچھ کہا نہیں"۔

خورشید نے گلہ صاف کیا اور بولا۔ "میری اپنی رائے تو یہ ہے کہ والدین کو چاہیئے کہ وہ اپنی اولاد کے ساتھ دوستوں جیسا سلوک کریں اِس طرح آج کل کے نوجوان اُن کی زیادہ سنیں گے۔ لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ جلدی میں ہوتے ہیں۔ یا بزرگ ہونے کی وجہ سے ہم سے اپنی بات منوانا چاہتے ہیں یا ہم سے ایسا سلوک کرتے ہیں گویا ہم صرف مٹی کے مادھو ہیں۔ تو اُس وقت ہم یعنی موجودہ نسل کے نوجوان اپنی مرضی کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں"۔

شاید آج خورشید کو پہلی بار اس بات کا احساس ہوا کہ اُس نے اپنے بزرگوں کو سمجھنے میں کتنی غلطی کی ہے۔ بزرگوں کا پورا پورا حق ہے کہ وہ نوجوانوں کے سر پر ہاتھ رکھیں۔ اور انہیں صحیح راستہ پر چلنے کی تلقین کریں۔ اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے وہ بولا۔ ہمیں بھی چاہیئے کہ ہم اپنے بزرگوں کی باتوں پر دھیان دیں۔ نہ معلوم کیا وجہ تھی کہ اسلم اِس بات کو بالکل بھُول گیا کہ اُس کے والد اُس کے دشمن تھوڑے ہی تھے۔ وہ تو صرف یہ چاہتے تھے کہ اسلم کو راہِ راست پر لائیں۔"

"اس کے علاوہ تم اور بھی کچھ کہنا چاہتے ہو؟" عبداللہ صاحب نے قالین پر سے اپنی نظریں نہ اٹھائیں۔

"جی۔ صرف ایک بات ہے اور وہ یہ ہے کہ اُس کو بار بار طعنہ دیا جاتا تھا کہ اُس کی بہن تو ہمیشہ اوّل درجہ حاصل کرتی ہے لیکن مرد ہوتے ہوئے بھی اُس کی برابری نہیں کر سکتا۔"

ثریا کا پارہ ایک دم چڑھ گیا۔ "خُدا کے لئے مجھے اس معاملہ میں نہ گھسیٹو۔ جو سُنے گا وہ یہی کہے گا کہ چونکہ اُس کی بہن ہمیشہ اوّل آتی تھی اِس لئے اُس کے گھر سے بھاگ جانے کی جڑ اُس کی بہن ہی ہے۔ تف۔"

وہ اُچک کر اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنی امی سے مخاطب ہو کر بولی۔ "امی جی۔ اب تو مجھے یہاں ہی رہنا پڑے گا۔ تھکان سے میرا بُرا حال ہے۔ آج سارا دن میں ایک ٹانگ پر کھڑی رہی ہوں۔ شاید سارا شہر ہی بیمار ہو کر ہسپتال میں داخل ہو گیا ہے۔ اچھا امی جی۔ شب بخیر، فکر نہ کریں۔ وہ ضرور واپس آ جائے گا۔"

اُس نے جھک کر اپنے ابّا اور ماموں کو سلام کیا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔

باب ۳

وہ شاندار موٹر رات کی تاریکی میں فراٹے بھرتی جا رہی تھی۔ خان صاحب نے اسلم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس سے پہلے کہ تم کچھ پوچھو، کہوں نہ میں ہی تمہیں ساری بات بتا دوں"۔ ایک پُراسرار سی ہنسی اُس کے ہونٹوں پر کھیل رہی تھی۔ "معلوم ہے موٹر کی ڈگی میں کیا ہے؟ شراب کی بوتلیں ہیں"۔

اسلم سانس روکے خان کی باتیں سن رہا تھا۔ "خان صاحب نے سیدھے بیٹھتے ہوئے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور کہا۔ "دراصل میں حکومت کا ایک خفیہ کارندہ ہوں"۔

اسلم کی آنکھوں کے آگے تارے ناچنے لگے۔ وہ تو کبھی سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ خان صاحب اور حکومت کا کیا ساتھ ہو سکتا ہے۔

لیکن خان صاحب نے بڑے اطمینان سے اپنا بیان جاری رکھا۔ "یہ مال جو کار میں رکھا ہوا ہے، یہ ہم نے ایک شخص سے ضبط کر لیا ہے، جو اسے سمگل کر کے لایا ہے۔ ہم اسے پنڈی تک لے جائیں گے۔ وہاں مجھے ایک اور ایجنٹ ملے گا۔ وہ یہ موٹر اور جو کچھ اس میں ہے ہم سے لے لیگا اور اُسے حکومت کے حوالے کر دے گا۔ پھر ہم ایک دوسری موٹر میں مری چلے جائیں گے"۔

خان صاحب کے چہرے پر بڑی دلفریب مسکراہٹ تھی۔ اُس نے اسلم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اگر تم میری نوکری کرنا منظور کر لو تو شاید کل صبح ہم مری سے روانہ ہو جائیں گے اور صوبہ سرحد کی طرف نکل جائیں گے۔ آج رات تمہارے پاس کافی وقت ہے۔ اچھی طرح سوچ لو اور صبح تک مجھے بتا دینا کہ تم میری نوکری کرنا چاہتے ہو یا نہیں۔ میرا اپنا اندازہ اور خیال تو یہی ہے کہ اس سنہری موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دو۔"

اسلم گم سم اپنی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ کیا یہ شخص واقعی حکومت کا خفیہ ایجنٹ ہے؟ اُس کی تیز طرار آنکھیں، اُس کے اچھے اطوار اور دلچسپ گفتگو سے تو وہ پڑھا لکھا معلوم ہوتا ہے اور شاید اس لئے گھٹیا اور سستے کپڑے پہنے ہوئے تھے کہ کوئی اُسے پہچان نہ سکے۔

اچانک ریڈیو پر جو گیت سنا جا رہے تھے وہ بند ہو گئے اور ایک عورت نے قدرے بھاری آواز میں ایک اعلان پڑھنا شروع کیا۔

"رضیہ بی بی دختر ریاض انسپکٹر آف سکولز کی لڑکی لاپتہ ہے۔"

اسلم نے بڑی بے دلی سے اُس خوبصورت لڑکی کا حلیہ سنا۔ اعلان میں یہ بھی بتایا گیا کہ شک ہے کہ شاید اُسے اغوا کر لیا گیا ہے۔ اُس نے دارا کی طرف دیکھا۔ وہ نہ جانے کیوں بڑے غور سے کان لگائے اُس اعلان کو سن رہا تھا۔ ذرا دیر بعد بے فکری کے تاثرات اُس کے چہرے پر نظر آئے۔ اسلم سوچنے لگا کہ یکایک دارا خاموش کیوں ہو گیا تھا؟ اور جب یہ کہا گیا کہ لاپتہ لڑکی کا ابھی تک کوئی سراغ نہیں مل سکا ہے تو اُس کی فکر کیوں ایک دم دور ہو گئی؟ وہ سوچنے لگا کہ شاید گھر سے بھاگنے کی وجہ سے اُس کے حواس قائم نہیں ہیں اس لئے وہ ہر چیز کو شک کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اُس نے دارا کی طرف دیکھتے ہوئے

مذاق میں کہا۔ "یہ لیجئے۔ آپ کے لئے ایک اور شکار ہے۔"

ایک لمحے تک تو اُس سے کوئی جواب بن نہ پڑا۔ لیکن جلد ہی مسکراہٹ سے اُس کا مُنہ پھیل گیا۔

"بیٹا۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔ دیکھو ہماری سرکار کو ہم جیسے وفادار اور دیانت دار لوگوں کی کس قدر ضرورت ہے۔ اسی لئے تو میں کہتا ہوں کہ اگر تم میری نوکری کرنا منظور کر لوگے تو اپنی سرکار کی سمگلنگ، اغوا اور چور بازاری ختم کرنے میں بڑی سرگرم خدمت انجام دوگے۔ اب بولو سرکار کے وفادار خادم، کیا خیال ہے تمہارا؟"

"لیکن میں یہ خدمت کیسے کر سکتا ہوں؟ اس کی تو میں نے کوئی تربیت حاصل نہیں کی ہے۔"

"ارے بابا۔ تم اس کی کیوں فکر کرتے ہو؟ تمہیں تو بس میرے ساتھ رہنا ہوگا۔ میرے ساتھ موٹر میں سفر کرنا ہوگا۔ اگر تم اپنی آنکھیں کھلی رکھو تو بہت تجربہ حاصل کر سکوگے۔ اگر اس کے بعد تمہیں کسی خاص تربیت کی ضرورت ہوئی تو میں اُس کا بندوبست بھی کر دوں گا۔"

"اچھا؟" اسلم نے شک کی آواز میں کہا۔ وہ ایک انجان سا خطرہ محسوس کر رہا تھا۔ جب ٹائر پنکچر ہوا، تو یہ اتنا گھبرا کیوں گیا تھا؟ کیا وہ پولیس سے ڈرتا ہے؟ جو کچھ بھی وہ کہتا ہے اگر وہ سب صحیح ہے تو پھر اُسے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟ نہ معلوم کیا بات ہے؟

اچانک انہیں اپنے پیچھے ایک تیز نیلی روشنی نظر آئی اور ایک سائرن گونجنے لگا۔ دارا اور اسلم دونوں کی جیسے جان ہی نکل گئی۔ دارا نے رفتار والا پیڈل دبا دیا اور موٹر ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ لیکن سائرن کی آواز تیز تر

اور نزدیک تر ہوتی چلی گئی۔ اسلم نے کچھ سوچ کر رفتار کم کر دی۔ اُسے اِس طرح بیوقوفی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیئے۔ وہ نیلی روشنی تیزی سے اُن کے برابر سے ہو کر گذر گئی اور انہیں بہت دور تک رات کی خاموشی کو چیرتی ہوئی سائرن کی آواز سنائی دیتی رہی۔

"ہائے میری توبہ" دارا نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔ اب اُس کی گھبراہٹ دُور ہو چکی تھی۔ "کوئی سخت بیمار ہے۔ اِسی لئے وہ ہسپتال والی گاڑی اتنی تیز جا رہی ہے"۔

اسلم نے اپنی بھینچی ہوئی مٹھیاں کھول دیں "میں۔ میں سوچ رہا تھا کہ پولیس ہمارے پیچھے لگی ہوئی ہے"۔ اُس کی آواز بڑی کانپ رہی تھی۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں بھی تو تمہیں اُن سے بچانا چاہتا تھا"۔ دارا نے زور سے اُس کا کندھا تھپتھپایا"۔

دانتوں سے اسلم اپنے ہونٹ کاٹنے لگا۔ اُس کے دل میں چند اور شکوک آنے لگے۔ دارا کس خوف کی وجہ سے اُس ایمبولینس سے بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا؟ وہ اتنا گھبرا کیوں گیا تھا؟ کیا وہ بھی پولیس والوں سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا؟

عین اُسی وقت رضیہ کے بارے میں ایک مرتبہ پھر ریڈیو پر اعلان دُہرایا گیا۔ اِس دفعہ اسلم نے ایک نئی بات سنی کہ اُس لڑکی کی دائیں آنکھ کے اوپر زخم کا ایک نشان ہے۔

خاموشی کو توڑنے کے لئے اسلم نے دارا سے پوچھا۔ "دارا صاحب، بھلا یہ کوئی آسان بات تھوڑی ہی ہے کہ اُس زخم کے نشان کی وجہ سے کوئی لڑکی کو ایک دم پہچان لے گا۔ اور اُس کے ماں باپ کے پاس واپس

پہنچا دے گا۔" دارا نے کوئی جواب نہ دیا۔ صرف ایک زوردار انگڑائی لی اور گاڑی کی رفتار کم کر دی۔ اب وہ ایک ایسی سڑک پر سے گذر رہے تھے جو مرمت کی وجہ سے بند تھی۔

"تم ٹھیک کہتے ہو بیٹا" اس نے گویا بات ٹالتے ہوئے کہا۔ "اور ہاں۔ اب نصف گھنٹہ میں ہم پنڈی پہنچنے والے ہیں۔"

اسلم سے ذرا دل لگی کرتے ہوئے کہا۔ "بیٹا اب بتاؤ کہ تم اس اپنے پنڈی والے چچا کے پاس جانا چاہتے ہو؟"

اسلم نے سر ہلا کر انکار کیا۔ اس نے اب ارادہ کر لیا تھا کہ وہ دارا کی نوکری منظور کر لے گا۔ اس سے بھلا اسے کیا نقصان پہنچ سکتا تھا۔ ایک طرف سے تو دارا بڑا دیانت دار اور پارسا نظر آتا تھا۔ شاید وہ ضرورت سے زیادہ اس کو شک کی نگاہ سے دیکھ رہا ہے۔ آخر وہ نوجوان ہے اور اچھی طرح اپنی دیکھ بھال کر سکتا ہے۔

"نہیں شکریہ۔ اگر آپ کا معاہدہ میرے ساتھ اب تک قائم ہے تو میں اسے قبول کرتا ہوں۔" اسلم نے فیصلہ کن لہجہ میں کہہ دیا۔

"تو بس، پھر تو معاملہ تہہ ہو گیا۔" دارا کی آواز میں اب تسلی تھی۔

اب انہیں راولپنڈی کی بتیاں نظر آنے لگیں۔ کہیں کوکا کولا۔ سیون اپ کے جلنے بجھنے والے بورڈ تھے تو کہیں حبیب بنک کے جن پر لکھا تھا "حبیب بنک کو بہتر خدمت کا موقع دیجئے۔"

چند منٹ کے بعد دارا نے ایک چھوٹی سی گلی میں اپنی موٹر گھما کر روک لیا۔ "یہ ہے ہماری منزل۔ یہاں ہمارے ساتھی یہ موٹر ہم سے لے لیں گے۔ سمجھ گئے نا؟"

جونہی وہ موٹر سے نیچے اتر کر بجلی کے کھمبے کے نیچے آئے تو ایک سایہ ان کی طرف بڑھتا ہوا نظر آیا۔ بڑے دوستانہ رویہ میں اس نے خان صاحب کو سلام کیا۔

"خوش آمدید موسم کیسا تھا؟ راستہ تو ٹھیک ہے نا؟"

خان صاحب نے بھی بڑی گرمجوشی سے جواب دیا۔

"موسم تو بڑا ہی اچھا تھا۔ کیوں ٹھیک ہے نا احسن؟"

خان صاحب نے اسلم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور آنے والے سے اُس کا تعارف کروایا۔ اِس کے بعد وہ نہ جانے کیا باتیں کرتے رہے۔ دبی آواز میں ذآرا نے اسلم کی کہانی اُسے بتائی تو اُس دوسرے شخص نے سر ہلا ہلا کر ذآرا کی تجویز سے اتفاق کیا کہ اسلم اُن کے لئے ایک بہت کام کا بندہ ثابت ہوگا۔

پہلے تو اسلم کو پتہ نہ چل سکا کہ کس احسن کا خان صاحب نے آنے والے سے تعارف کروایا ہے، لیکن اب اُسے پتہ چلا کہ یہ تو اُس کا نام رکھا گیا تھا۔ دراصل اگر اُسے اُس کے اپنے ہی نام سے پکارا جاتا تو یہ خطرہ مول لینے والی بات ہوتی۔

دوسرا آدمی جس سے اسلم کا تعارف کرایا گیا تھا، اُس نے چادر اوڑھ رکھی تھی اور عمر میں ذآرا سے کم معلوم دیتا تھا۔ اب اُس نے اُردو میں ایک بڑا عجیب سوال پوچھا۔

"راستہ میں گدھے تو نظر نہیں آئے؟" اسلم یہ سوال سُن کر کچھ سمجھ نہ سکا اور بڑا ہی حیران ہوا۔ "اندھیرا تھا۔ اس لئے گدھے تو نظر نہیں آئے اور پھر بھلا کہیں گدھے رات کو اڑتے ہیں؟ وہ تو سو رہے ہوں گے۔" اسلم نے کہا۔

ذآرا اور اُس کا ساتھی ہنسنے لگے اور اِس مذاق کا انہیں بڑا ہی لطف آیا۔

آخر خان نے اُس شخص سے ہاتھ ملایا۔ دوسری موٹر کی چابی لی اور سڑک کے دوسری طرف جانے لگے۔ ایک جھاڑی کی اوٹ میں موٹر کھڑی دیکھ کر وہ بڑا حیران ہوا۔ "گل خان یہ تو مرسیڈیز کار ہے۔ میرا خیال تھا تم میرے لئے ٹیوٹا کار لاؤ گے۔"

گل خان لپک کر خان صاحب کے پاس آیا اور اُسے بتایا۔

"آپ کو مائی اور بہن بھی تو مری سے آپ کے ساتھ جائیں گی۔ آپ کی بہن ذرا بیمار ہے۔ اس لئے آپ کو بڑی گاڑی کی ضرورت ہوگی اور وہ جناب کے سامنے حاضر ہے۔

ارے ہاں۔ میں یہ بتانا تو بھول ہی گیا تھا کہ ڈاک خانہ کے پاس بابا آپ کا انتظار کر رہا ہوگا۔ وہ آپ کو سب خبر دے گا۔ وہاں سے گھر ٹیلیفون کرنا نہ بھولنا۔ گھر والے مری کا موسم جاننے کے انتظار میں ہیں۔ شاید اب وہ چھٹی گذارنے یہاں آنا چاہتے ہیں۔ انہیں موسم کا بتانا نہ بھولنا۔"

دونوں نے پھر سے ہاتھ ملایا۔ اور ہنستے ہوئے اپنی اپنی راہ لی۔

اسکم کی سمجھ میں گرچہ کچھ نہ آیا تھا لیکن وہ اتنا ضرور سمجھ گیا تھا کہ دونوں آدمی ایک دوسرے سے ملے تو بڑی محبت سے ہیں لیکن وہ دوسرا شخص خان صاحب کا ماتحت معلوم ہوتا تھا۔ شاید وہ بھی اُس کا نوکر تھا۔

اِس وقت بھوک سے اسکم کے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔ اُس کا تو جیسے دم نکل رہا تھا لیکن موٹر چلاتے ہی دارا نے اُس سے کہا۔ "دیکھو پچھلی سیٹ پر پراٹھے اور تلے ہوئے انڈے ہوں گے۔"

واقعی۔ اسکم نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ایک لفافے میں پراٹھے اور انڈے ایک لفافے میں سموسے، ایک اور میں سنگترے اور بیٹ کے نیچے کوکا کولا کی ٹھنڈی ٹھنڈی بوتلیں پڑی تھیں۔ موٹر بڑی تیز رفتاری سے مری کی طرف بھاگی چلی جا رہی تھی اور دونوں چٹخارے لے لے کر پراٹھے کھا رہے تھے اور ٹھنڈی ٹھنڈی بوتلیں پی رہے تھے۔ دارا بڑا ہی خوش نظر آتا تھا۔ اُس نے ایک فلمی گیت گانا شروع کر دیا۔ اب وہ اسکم کو یہ بتا رہا تھا کہ لڑکپن میں جب وہ انگلینڈ کے ایک

سکول میں پڑھتا تھا تو وہاں اُس نے کیا کیا دیکھا تھا۔ کبھی کبھی جب وہ کوئی مزیدار سا چٹکلا سناتا تو وہ دونوں دیر تک زور زور سے ہنستے رہتے۔ اِس وقت اسلم بڑے اطمینان سے بیٹھا ہوا سوچ رہا تھا کہ کبھی خان صاحب بھی لڑکا تھا اور اُس نے باہر کے ملکوں میں کتنی سیر کی ہے۔ اس لئے تو وہ اتنا ہوشیار اور سمجھ دار ہے۔ اب اسلم نے دل میں پختہ ارادہ کر لیا تھا کہ وہ خان صاحب کے ساتھ ہی رہے گا تاکہ وہ بھی غیر ممالک کی سیر کر سکے اور جہاں تک ہو سکے یوں اپنی علمیت بڑھائے۔

وہ مری کی چڑھائی چڑھ رہے تھے۔ اسلم نے کھڑکی سے باہر دیکھنے کی کوشش کی لیکن باہر اندھیرا گھُپ تھا۔ اُسے کچھ دکھائی نہ دیا۔ ایک دفعہ وہ ایک چنگی پر رُکے اور دوسری بار سڑک کا ٹیکس دیتے۔ جب وہ محصول چنگی پر کھڑے ہوئے تھے تو نہ جانے کیوں اسلم کے ذہن میں یہ سوال اُبھرا۔

"محصول سے بچنے کے لئے تو خان صاحب نے پہلی موٹر پنڈی میں نہیں چھوڑی؟"

عین اُسی وقت بک جھٹکے سے موٹر آگے بڑھی اور اسلم سب کچھ بھُول گیا۔

ڈاک خانہ کے باہر ایک بوڑھا آدمی اُن کا انتظار کر رہا تھا۔ اُس کا چہرہ جھُریوں سے اَٹا پڑا تھا۔ اسلم کو موٹر میں ہی چھوڑ کر خان صاحب اُس بوڑھے کو ملنے موٹر سے اتر گئے۔ وہ دیر تک دبی آواز میں گفتگو کرتے رہے۔ یہاں بھی اسلم نے بڑی صفائی سے اُن کے یہ الفاظ سُنے۔

"موسم بالکل ٹھیک ہے۔ راستہ میں گِدھ بھی نہیں ہیں"

اسلم بڑا حیران ہو رہا تھا کہ یہ 'موسم' اور 'گِدھ' کے الفاظ جو بار بار دہرائے جاتے ہیں ان کا مطلب کیا ہے؟ ان میں ضرور کوئی راز ہوگا۔ پھر اِس بات سے اُس نے اپنے کو تسلّی دی کہ خان صاحب چونکہ خفیہ محکمہ میں ملازم ہیں اس لئے ضرور خُفیہ الفاظ میں ہی بات چیت کرتے ہوں گے، عام زبان میں گفتگو

کرنا شاید اُن کے لئے مناسب نہ ہو۔ یہ سوچ کر اُسے پھر ذہنی سکون سا ملا۔ اب اگر وہ کچھ چاہتا تھا تو صرف یہ تھا کہ وہ بھی جلد از جلد کام شروع کر دے، تاکہ جب اُس کے کارناموں کی خبر اُس کے گھر پہنچے تو اُس کے والدین، خاص کر اُس کی بہن ثریا اُس پر رشک کرے۔ گھر کے بارے میں خیال آتے ہی وہ بڑا بے چین سا ہوا۔ دل میں ایک خواہش پیدا ہوئی کہ کاش وہ انہیں صرف اتنا بتا دے کہ وہ خیر خیریت سے ہے اور وہ اُس کی فکر نہ کریں۔ چند دن بعد وہ ضرور اپنے گھر کوئی نہ کوئی اطلاع بھیجے گا۔

اب خان صاحب واپس آ رہے تھے۔ موٹر چلاتے ہوئے انہوں نے اسلم سے کہا "آج ہم ایک دوست کے گھر میں رات گزاریں گے۔ وہ دوست قدرے غریب ہے۔ ہوا یوں، کہ میری بہن اپنی نانی جی کو ملنے گئی ہوئی تھی۔ اچانک اُس کی طبیعت سخت خراب ہو گئی۔ اس لئے وہ اُسی جگہ ٹھہر گئی۔ اب مجھے اُسے اُس کے گھر لے جانا ہوگا۔ چار مہینہ پہلے میری بہن کی شادی ہوئی تھی۔ ان لڑکیوں کی جب شادی ہو جاتی ہے تو وہ بہت ہی گھبرا جاتی ہیں۔ وہ اپنی نانی کے پاس اس لئے گئی تھی کہ اُسے اپنے ساتھ اپنے بنگلے میں لے آئے۔ تاکہ وہ بعد میں بچے کی دیکھ بھال کر سکے۔ تم جانتے ہی ہو نا کہ یہ بوڑھیاں بڑی اچھی طرح بچوں کی دیکھ بھال کرتی ہیں۔"

انہوں نے موٹر کو ایک گراج میں بند کر دیا۔ وہ بوڑھا جو انہیں ڈاکخانہ کے باہر ملا تھا اب پیدل ہی وہاں پہنچ گیا تھا۔ اُس نے گراج کا دروازہ بند کیا اور اُن کے آگے آگے چلنے لگا۔ وہ مری سے نیچے کی طرف جا رہے تھے اور پکی سڑک چھوڑ کر پگڈنڈی پر چل رہے تھے جو ایک کھیت میں سے ہو کر جاتی تھی۔ دارا نے اسلم کا بازو تھام کر کہا۔ "ہم جلد ہی اُس مکان میں پہنچ جائیں گے۔

تم نے دیکھا ہوگا کہ اس وقت مری بالکل اجڑی اجڑی سی ہے۔ اس وقت یہاں کوئی نہیں ہوتا لیکن اگر تم یہاں مئی، جون، جولائی یا اگست میں آؤ تو پھر یہاں کی رونق دیکھ سکتے ہو۔ یہاں اتنی بھیڑ ہوتی ہے کہ چلنا محال ہو جاتا ہے۔ مال روڈ سے تو گذرنا ہی مشکل ہوتا ہے۔"

بوڑھے نے بھی سر ہلا کر ہاں میں ہاں ملائی۔ اس وقت اسلم کو کسی چیز کی خواہش نہ تھی۔ وہ اتنا تھکا ہوا تھا کہ مشکل سے چل سکتا تھا۔ بس یہی چاہتا تھا کہ اُسے پلنگ نصیب ہو، وہ پاؤں پسار کر اُس پر لیٹ رہے۔ لیکن خان صاحب کہے چلے جا رہے تھے۔

"بابا جی بڑے ہی مہربان ہیں۔ انہوں نے ہمیں اپنا کمرہ دے دیا ہے کہ آج رات ہم اُس میں سوئیں۔ میں اگر اکیلا ہوتا تو اپنی نانی جی کے گھر چلا جاتا۔ لیکن آج چونکہ تم میرے ساتھ ہو اس لئے میں نے بابا کی بات مان لی ہے اور اُس کے گھر میں ٹھہر جاؤں گا۔"

جب بابا انہیں مٹی کی کچی کوٹھری میں لے گیا تو اسلم بڑا ہی حیران ہوا۔ تھکان سے تو اس کی جان نکل رہی تھی اس لئے اُسے کوئی پروا نہ تھی کہ وہ کوٹھری کچی ہے یا پکی۔ تکیئے پر سر رکھتے ہی وہ دنیا سے بے خبر نیند کی وادیوں میں گم ہو گیا۔

دوسرے دن جب اسلم کی آنکھ کھلی تو نو بج چکے تھے۔ "میں کہاں ہوں؟ کس کے ساتھ ہوں؟" اُسے کچھ سمجھ نہ آ رہا تھا۔ "ہیں۔ ایک کچی کوٹھری میں"، وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔

"بیٹا خوب سوئے؟" یہ خان صاحب کی آواز تھی۔

اسلم نے آنکھیں ملتے ہوئے خان صاحب کی طرف دیکھا۔

"ہیں !!! یہ کیا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے وہ ادھر دیکھتا ہی رہ گیا۔ اُس کے منہ سے ایسی آواز نکلی جیسے مچھلی کی گلپھڑوں سے آتی ہے جب اُسے پانی سے باہر نکال پھینکتے ہیں۔ وہ تو اپنا منہ ہی بند کرنا بھول گیا۔

"خ۔ خ۔ خان صاحب۔ یہ کیا آپ ہی ہیں ؟ میں مان نہیں سکتا۔"

اُس کے سامنے سنہری رنگ کی بیل باٹم پتلون۔ لمبے لمبے کالر والی چیکدار قمیض اور بڑی قیمتی جیکٹ پہنے خان صاحب کھڑے تھے۔ منہ پر ڈاڑھی غائب تھی اور نہ جانے موجودہ فیشن کے مطابق لمبے لمبے گھنگھریالے بال جو کندھوں تک پہنچتے تھے کس طرح راتوں رات بڑھ گئے تھے۔ اُن کے بات کرنے سے ہی اسلم کو پتہ چل سکا کہ یہ تو وہی خان صاحب ہیں۔

"اب سے میرا نام چارلی ہوگا۔ تمہیں یہ یاد رکھنا ہوگا۔" انہوں نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ "اِس وقت ہمیں یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ آئندہ ہم کس طرح ایک دوسرے سے ملیں گے اور بات چیت کریں گے۔"

اسلم جلدی سے اپنے بستر پر بیٹھ گیا اور غور سے سننے لگا۔

چارلی صاحب نے ایک سگریٹ سلگایا اور دھواں فضا میں چھوڑتے ہوئے کہا۔ "احسن۔ مجھے دیکھ کر تمہیں بالکل تعجب نہیں کرنا چاہیئے کہ میں اِس وقت کوئی اَور انسان ہوں۔ اور اپنا نیا نام ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اب تم اسلم نہیں بلکہ احسن ہو۔ یہ پہلی بات ہے اور دوسری یہ کہ یہ کبھی نہ بھولنا، کہ میں حکومت کا خفیہ ملازم ہوں، میرا کام خطرناک عادی مجرموں کے درمیان ہے۔ میں یہ معلوم کرتا ہوں کہ اس ملک میں سمگلنگ کا واہیات کام کون کرتا ہے۔ اور اُن کے ٹھکانے کہاں ہیں۔ اِس لئے یہ ضروری ہے کہ کوئی مجھے پہچان

نہ سکے کہ میں کون ہوں۔ میں بھیس بدلتا رہتا ہوں اور آج سے بیٹا تمہیں بھی اپنا حلیہ بدل کر رہنا ہوگا۔"

نئے احسن نے سر ہلایا۔

"درست ہے۔ لیکن مسٹر چارلی۔ مجھے یہاں کون جانتا ہے؟"

چارلی مسکرا دیا۔ "شروع سے ہی اگر تم خبردار رہے تو پھر تمہیں ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

اُس نے ایک بکس کھولا۔ اُس میں سے مصنوعی مونچھیں، لمبی ڈاڑھی اور بالوں کی ایک ٹوپی نکالی۔ تینوں چیزیں سفید تھیں۔ پھر بکس کے نیچے سے اُس نے کالے رنگ کا ایک قیمتی سوٹ نکالا۔ غور سے دیکھا۔ لیکن سر ہلا کر اُسے بستر پر پھینک دیا اور کہا "تمہیں یہ بہت بڑا ہوگا۔"

ایک اور بکس میں اُسے کچھ نہ ملا۔ تیسرے بکس میں سے ایک کالا سوٹ مل گیا جو احسن کو پورا آتا تھا۔ پھر اُس نے ایک سفید قمیض نکالی۔ "مسٹر احسن! اب بستر سے باہر نکلو۔ اور سوٹ پہن لو۔ ڈاڑھی مونچھیں لگا کر اور وہ ٹوپی پہن کر تمہیں ایک دم محسوس ہونے لگے گا کہ تم تو کوئی اور ہی ہستی ہو۔"

اگر پہلا سا وقت ہوتا، تو اسلم بڑے شوق سے مونچھیں ڈاڑھی لگا کر اپنا حلیہ بدل لیتا اور یہ ظاہر کرتا کہ وہ کوئی بہت بڑی شخصیت ہے یا کوئی بزرگ انسان ہے۔ کسی ڈرامے میں حصہ لینے کے لئے بہروپ بدلنا تو ایک بات ہوتی ہے۔ لیکن یہاں تو بات ہی کچھ اور تھی، اور اب اس کے بغیر چارہ بھی نہ تھا۔

سیاہ سوٹ پہنتے وقت وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔ لیکن جب چارلی نے اُس کے منہ پر ڈاڑھی اور مونچھیں لگا دیں اور سر پر بالوں والی ٹوپی پہنا دی،

تو احسن اپنے آپ کو شیشے میں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ ایک بڑا بارعب اور کافی عمر والا شخص نظر آ رہا تھا۔

"میں تو کسی سکول کا ہیڈ ماسٹر یا کالج کا پروفیسر نظر آتا ہوں، اور عمر میں بھی آپ سے بڑا لگتا ہوں۔ یعنی خا۔۔۔! نہیں میرا مطلب ہے مسٹر چارلی صاحب میں آپ کا والد بزرگوار لگتا ہوں؟"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے" چارلی نے اُسے ہر طرف سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "اب یہ کبھی نہ بھولنا کہ تم ایک معزز پروفیسر ہو۔ اور اب تمہیں بالکل ویسا ہی اپنے کو ظاہر کرنا ہوگا۔ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھانے ہوں گے۔ اپنے کسی کام میں بھی تیزی طراری دکھائی نہ دے۔ اور خدا کے لئے کوئی بھی بچگانہ حرکت نہ ہونے پائے۔"

اس مرتبہ بھی بالوں والی ٹوپی کو ٹھیک کر کے چارلی نے احسن کے چہرے پر نظر دوڑائی۔ "تمہاری آنکھوں سے معلوم ہو جاتا ہے کہ تم کم عمر ہو۔ پھر وہ کہیں سے ایک سنہری فریم والی عینک لے آیا اور اُس کے منہ پر جماتے ہوئے بولا۔

"اب تو میرا یار بالکل پروفیسر بن ہی گیا ہے۔"

جب چارلی کو ہر طرح سے اطمینان ہو گیا تو احسن کے کندھے کو تھپکاتے ہوئے کہا۔ "واہ میرے پروفیسر صاحب بہادر۔ بہت اچھا! تم ایک نوعمر لڑکے سے ایک بزرگ شخص بن گئے ہو۔ بوڑھا نظر آنے کے کئی فائدے ہیں۔ ہر شخص بزرگ کی عزت کرتا ہے اور اُس کے کسی بھی کام میں ٹانگ نہیں اڑاتا۔"

لیکن احسن کے دل میں رہ رہ کر یہ خیال آ رہا تھا کہ یہ سوانگ وہ بھلا کتنی دیر تک رچائے رکھے گا۔

اُسے قدرے اُداس دیکھ کر چارلی سمجھ گیا کہ کیا بات ہے۔ جھٹ اُسے تسلی دی "فکر کیوں کرتے ہو؟ ذرا سی مشق کی ضرورت ہے۔ اِس کے بعد دیکھنا، تم خود ہی اِس کام میں کتنی دلچسپی لینے لگو گے۔ میری اور تمہاری کامیابی کا کُل دارومدار ہی اِس بات پر ہے کہ اِس کام میں مہارت حاصل کرلیں۔ اور ہاں۔ مجھے یاد آیا۔ جب میرا پروفیسر صبح ناشتے لے رہا تھا تو مَیں نے صبح آٹھ بجے کی خبریں ریڈیو پر سُنی تھیں۔ تمہاری تلاش میں پولیس نے سرحدی چوکیوں کی ناکہ بندی کر رکھی ہے۔" پھر رومال سے اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا "جب کوئی اغوا کر لیا جاتا ہے تو ہم سرکاری ملازم سب سے پہلے سرحدی علاقوں میں اُسے تلاش کرنے جاتے ہیں اب میری تجویز یہ ہے کہ ہم ایک دم اُدھر نہیں جائیں گے بلکہ چند دن اور یہاں ہی گذاریں گے۔ اب تم ایک باعزت اور بزرگ پروفیسر ہو۔ اس لئے کوئی حرج نہیں کہ تم باہر نکلو۔ سب سے محفوظ بات یہ ہوتی ہے کہ باہر نکل کر لوگوں میں گھل مِل جاؤ۔ اب ہم کسی شاندار ہوٹل میں چلتے ہیں وہاں ہمیں بڑا چوکنا رہنا پڑے گا تاکہ ہر چیز پر ہماری نگاہ ہو اور ہر بات ہم سن سکیں۔ اس میں بڑا لطف رہے گا۔ ارے بابا!!! تم اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟ فکر نہ کرو۔ میں تمہارے ساتھ ساتھ رہوں گا اور قدم قدم پر تمہاری رہنمائی کرتا رہوں گا اور مکمل تربیت دوں گا۔"

"چارلی۔ آپ کی بہن کا کیا حال ہے؟"

چارلی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "بہن؟ ارہاں۔ ابھی وہ سفر کرنے کے لائق نہیں۔"

اسلم دل میں بڑا حیران تھا کہ خان کے دل میں اپنی بہن کے لئے کوئی ہمدردی یا لگاؤ نظر نہیں آتا۔ وہ بچاری تو مٹی کے کچے کوٹھے میں بیمار ہے اور اِس شخص

کو اُس کی کوئی بھی پرواہ نہیں۔ عین اُسی وقت چارلی بول اٹھا۔
"تیار ہونا؟ میں یہ ظاہر کروں گا کہ باہر سیر کرنے جا رہا ہوں اور تم ٹھیک دس منٹ بعد میرے پیچھے نکل پڑنا۔ بابا تمہیں راستہ بتانے کے لئے تمہارے ساتھ ہوگا۔ اُس کے ہاتھ میں سودا خریدنے کے لئے ٹوکری ہوگی اور وہ تمہارے آگے آہستہ آہستہ چلے گا۔ خیال رکھنا کہ تم دونوں میں کوئی تعلق یا واسطہ نظر نہ آئے۔ سمجھ گئے نا؟ ہم مال روڈ پر ملیں گے۔ وہاں سے ہم "دیلی ویو" ہوٹل کی طرف نکل جائیں گے۔ وہ بڑی پُرسکون اور آرام دہ جگہ ہے۔ بھوک کے مارے احسن کے پیٹ میں پھر آوازیں آ رہی تھیں۔
چارلی نہ جانے کیسے ایک دم سمجھ گیا اور اُس کے کان میں آہستہ سے کہا۔ "محترم پروفیسر صاحب۔ ناشتہ وہیں ہوگا۔ ذرا جلدی تشریف لے آیئے گا۔"
اسلم نے اپنی گھڑی پر نگاہ ڈالی اور کہا "میں ٹھیک دس منٹ بعد روانہ ہو جاؤں گا۔"

اُس نے پھر آئینہ میں اپنے آپ کو دیکھا تو بے اختیار ہنس دیا۔ "واقعی۔ مَیں تو بالکل بدل گیا ہوں۔" پھر غور سے آئینہ میں دیکھتے ہوئے بولا "ہیلو مسٹر احسن، مزاج بخیر؟ آپ سے مل کر دلی مسرت ہوئی ہے۔ عزّت افزائی ہے حضور کی۔ قدم رنجہ فرمایئے۔" اور پھر زور زور سے ہنسنے لگا۔
اچانک اُس کے کانوں میں کسی لڑکی کی آواز آئی جو بڑی منّت کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "مجھے تازہ ہوا۔ مجھے ایک سانس تو لے لینے دو۔"
پھر کسی بوڑھی عورت کی آواز آئی۔ "اُس نے دیکھ لیا تو گولی مار دے گا۔"

لیکن لڑکی اُونچی آواز میں بولی۔ "باہر تو کوئی نہیں ہے۔ ہائے مَیں کہاں

آن پھنسی۔"

اسلم کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا "یہ کون تھی؟ اُسے باہر آنے کی اجازت کیوں نہیں ہے؟" اُس نے تھوڑا سا دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ سامنے بھی ایک کچی جھونپڑی تھی۔ ایک بوڑھی عورت ایک نوجوان لڑکی کو اندر کھینچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اُسے پھر آواز آئی۔

"بس اب تمہاری شادی ہو جائے گی تو پھر آزادی سے باہر گھوم سکو گی۔"

اسلم سوچ رہا تھا۔ "ہے تو یہ چارلی کی بہن۔ لیکن اُس کی بہن تو شادی شدہ ہے۔" اسے ایسا لگا کہ اس نے لڑکی کے ماتھے پر زخم کا نشان سا دیکھا "کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ" دروازہ پر کسی نے دستک دی تو اسلم کی جیسے روح قبض ہو گئی ہو۔ بابا کا سانس چڑھا ہوا تھا۔ اُس نے کہا۔ "مسٹر میں جا رہا ہوں۔"

"بہت بہتر" اسلم کی آواز میں لرزش تھی۔ وہ سوچنے لگا "میرے کانوں کو دھوکا ہوا ہوگا۔ وہ لڑکی شاید تماشا ہی کر رہی ہوگی۔ ضرور وہ بچپن میں بڑی شرارتی ہوگی۔ مجھے بلا سے۔۔۔۔ مجھے اُس سے کیا۔"

یہ سوچتے سوچتے وہ بزرگ رعب داب والا پروفیسر کمرے سے باہر تشریف لایا۔ پگڈنڈی پر سے ہوتا ہوا بڑی سڑک پر اپنے رہبر کے پیچھے بڑے نپے تُلے قدم دھرتا آگے بڑھا۔ سورج کی روشنی کتنی بھلی تھی۔ چاروں طرف پہاڑیوں کی چوٹیوں پر برف جمی ہوئی تھی اور سورج کی روشنی میں جھلمل جھلمل کر رہی تھی۔ اسلم کو یہ اچھی طرح یاد تھا کہ وہ ایک بزرگ ہستی ہے، اس لئے وہ آہستہ آہستہ چلے۔ دو ایک ٹٹو والے اُس کے قریب آئے اور پوچھا کہ کیا وہ سواری کرنا چاہتے ہیں؟ ایک کمزور سا شخص جس کی کمر میں سوکھی لکڑیوں کا ایک گٹھا تھا اور ناک پر موٹے موٹے شیشوں والی عینک تھی، ہانپتا کانپتا اوپر چڑھ رہا تھا۔

لکڑیاں بہت بھاری تھیں لیکن آخر اُس نے بھی تو وہ بیچ کر اپنے بال بچّوں کے لئے آٹا خریدنا تھا۔ اس لئے گرتا پڑتا بڑھ ہی رہا تھا۔

اسکم نے اپنی قمیض کی جیب میں ہاتھ مار کر پھر تسلّی کر لی کہ ڈیڑھ سو روپیہ اب تک اُس کے پاس بالکل محفوظ تھا۔ سوٹ پہننے کے بعد سب سے پہلا کام اُس نے یہی کیا تھا کہ اپنے خزانے کو اندر والی جیب میں ڈال لیا تھا۔

"یہی تو میری ساری دولت ہے۔ اس کی حفاظت تو مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ کرنی چاہیئے"

بابا اپنی سودے سلف والی ٹوکری لئے آگے آگے جا رہا تھا اور پھر ایک گلی میں غائب ہو گیا۔ سامنے ڈاک خانہ تھا۔ اسکم اِس جگہ کو ایک دم پہچان گیا کہ رات کو وہ اِسی جگہ رُکے تھے۔ مال پر اِکّا دُکّا آدمی تھے۔ مزدوری کی تلاش میں قلی اِدھر اُدھر بیٹھے ہوئے تھے۔ گھوڑے والے بھی کسی گاہک کے منتظر تھے اور اخبار بیچنے والے لڑکے راہ گذروں کو اخبار بیچنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔

سامنے چارلی کھڑا اپنی سگریٹ سلگا رہا تھا۔ اِس وقت وہ کتنا رُعب داب والا جنٹلمین دکھائی دے رہا تھا۔ اُس نے ایک چھڑی بھی خریدی تھی۔ ایک عجیب انداز میں وہ اُس کی طرف بڑھا۔

"میرے بزرگ مسٹر احسن!!! آپ کہاں ہیں؟ آپ سے مل کر مجھے بڑی خوشی ہوئی ہے۔ بڑی مُدت کے بعد آپ سے ملاقات ہوئی۔ کیا حال ہے؟ صحت تو ٹھیک ہے نا؟" اپنی چھڑی کا سہارا لیتے ہوئے چارلی نے جُھک کر اسکم کی طرف دیکھا اور بڑی خوشی کے لہجے میں کہا۔

"مسٹر احسن کیا آپ آج ہی تشریف لائے ہیں؟ میں تو کئی دن سے

یہاں ہوں۔ لیکن آپ کو آج ہی دیکھا ہے۔ میرا اندازہ بالکل ٹھیک ہی ہوگا کہ آپ اپنے پسندیدہ ہوٹل ڈیلی ویو میں ہی تشریف رکھتے ہوں گے ٹھیک ہے نا؟"
چارلی نے بڑے ادب سے اپنے بزرگ دوست کے کندھوں پر ہاتھ رکھا اور تجویز پیش کی۔

"یہ میری بڑی عزت افزائی ہوگی اگر میرے بزرگ و مہربان دوست میرے ساتھ چائے کا ایک پیالہ نوش فرمائیں۔ میں بھی آپ ہی والے ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہوں۔"

اسلم نے جب یہ دیکھا کہ چارلی ہی بڑے ماہر استاد کی طرح خوداری بات چیت کر رہا ہے تو وہ محسوس کرنے لگا کہ وہ اپنا پارٹ ٹھیک طرح ادا نہیں کر رہا ہے۔ اور وہ دل میں ڈر رہا تھا کہ استاد چارلی اُس کی سب غلط حرکتوں کا جائزہ لے رہا ہے اور بعد میں اُسے ضرور ڈانٹ پلائے گا۔

جب وہ دونوں قدم سے قدم ملائے مال روڈ پر جا رہے تھے تو اسلم بھی اپنا کردار بہتر طور پر پیش کرنے کے خیال سے گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ "واہ کیا نظارہ ہے۔ بھلا اس سے بہتر نظارہ کہیں اور ہو سکتا ہے؟"

چارلی نے بھی سر ہلایا جس کا مطلب یہ تھا کہ آپ ٹھیک کہتے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی کہ شاباش اب تم ٹھیک چل رہے ہو۔ اب تو اسلم کی ہمت بندھ گئی۔ اُس نے ایک اور سوال پوچھا "دوست، اب بھی گھوڑے کی سواری کرنے کے شوقین ہو؟ میں شرط لگاتا ہوں کہ اس عمر میں بھی میں تمہیں آگے نہیں نکلنے دوں گا۔"

چارلی بڑا ہی خوش ہوا۔ "یہ لڑکا تو چھپا رستم نکلا!! یہ تو جلد ہی میرے ٹولے میں اچھا مقام حاصل کرے گا!! اُستاد جی۔ پھر چائے کے بعد ہو جائے۔

ہم بھی دیکھیں کہ آپ میں ابھی کتنا دم خم ہے۔"

اب تو جناب پروفیسر کی گویا نانی مرگئی یہ سوچ کر وہ گھبرا گیا کہ اِس ڈاڑھی مونچھ اور بالوں کے ساتھ وہ کس طرح گھوڑے پر چڑھے گا؟ چارلی کی کمر میں ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔

"تو جناب یہ چاہتے ہیں کہ میں اپنی کوئی ہڈی پسلی تڑوا کر ہسپتال میں پڑجاؤں؟ نہ بابا نہ۔ ہم تو یہاں آرام کرنے آئے ہیں، گھوڑے دوڑانے نہیں" پروفیسر احسن نے اپنی سفید ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا۔

چارلی نے بھی سر کے اشارے سے کہا "آپ درست فرماتے ہیں"۔ سگریٹ کی ڈبیہ آگے بڑھاتے ہوئے کہا "شوق فرمائیں گے؟" لیکن پروفیسر صاحب نے ہاتھ کے اشارے سے انکار کردیا۔

"ڈاکٹر نے مجھے سگریٹ پینے سے منع کردیا ہے۔ اب تو مجھے اپنی صحت کا بہت خیال رکھنا پڑتا ہے۔"

چارلی نے اپنے لئے ایک سگریٹ نکالی۔ ہونٹوں میں دباتے ہوئے اُس نے پروفیسر صاحب کی طرف دیکھا اور خاموش نگاہوں میں کہا۔ "بیٹا بہت اچھا" دل میں یہ بھی کہہ رہا تھا "اچھا ہی ہوا کہ اُس نے سگریٹ پینے سے انکار کردیا۔ پہلی مرتبہ سگریٹ پینے سے اُسے شدید کھانسی اٹھتی تو کھانسی کے زور سے ڈاڑھی مونچھ یا ٹوپی کب اپنی جگہ قائم رہتی۔ اچھا ہوا کہ اُس نے یہ غلطی نہ کی۔"

باب ۴

ایک ہفتہ گذر گیا، اب اسکم کے والدین بالکل مایوس ہو چکے تھے کہ وہ انہیں دوبارہ ملے گا۔ لڑکے کا نام و نشان نہ تھا۔ شاید اُسے کسی نے قتل کر دیا ہو اور لاش کسی ویران جگہ زمین میں گاڑ دی ہو۔ اسکم کے والد صاحب نے ورکشاپ پھر جانا شروع کر دیا۔ کیونکہ آخر کام کاج تو کرنا ہی تھا۔ لیکن انہیں اپنے لڑکے کے چلے جانے کا شدید احساس تھا اور اپنے اُن سخت الفاظ کے منہ سے نکلنے پر بے حد شرمندہ اور نادم تھے۔ کاش اُن کی زبان سے وہ سخت الفاظ نہ نکلتے۔ انہوں نے اب تو دوستوں کے مجلس میں بیٹھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ اُن کا چھوٹا سا بنگلہ اسکم کے چلے جانے کے بعد بالکل سُونا سُونا سا ہو گیا تھا۔

اسکم کی امی کی حالت بھی سنبھل نہ سکی۔ ساری رات وہ اپنے بیٹے کے انتظار میں بیٹھی رہتیں۔ اب تو انہیں ڈاکٹر نے چند ایسے ٹیکے اور گولیاں تجویز کیں جن سے وہ سو سکیں۔ جب تک دوا کا اثر رہتا وہ سوئی رہتیں لیکن اثر کے زائل ہوتے ہی وہ باہر برآمدے میں آ بیٹھتیں اور دروازے کی طرف ٹکٹکی لگا کر دیکھنے لگتیں۔

آج جمعرات تھی۔ اسکم کو غائب ہوئے آج پورا ایک ہفتہ گذر چکا تھا۔

سورج کی روپہلی کرنیں سرخ گلاب کے پھولوں کو چوم رہی تھیں موتیے کے پودے سے خوشبو کے بھبھکے اٹھ رہے تھے اور کیاریوں میں رنگ برنگے پھول ہوا سے ہلتے ایسے لگتے تھے جیسے خوشی میں ناچ رہے ہوں۔ بوڑھا لعل، شریفہ کا خاوند، باغ کی باڑھ کو چھانٹ رہا تھا۔ بار بار وہ اپنا ہاتھ روک لیتا۔ کچھ اُس کی عمر کا تقاضا تھا کہ وہ دم لینے کو رُک جاتا تھا۔ سائیکل پر اخبار والا آیا۔ دروازے سے سائیکل ٹکائی اور لعل کو سلام کر کے اُس کے ہاتھ میں اخبار تھما دی۔

"بابا جی۔ یہ لیں اخبار۔ صاحب انتظار میں ہوں گے۔"

جب لعل نے اخبار لے لی تو اخبار والے نے پوچھا۔

"سنائیں۔ کچھ صاحبزادے کا پتہ چلا؟"

"کچھ بھی تو نہیں۔"

لعل نے اپنی قمیض سے ہاتھ پونچھے اور قمیض پر ہرے رنگ کا ایک بڑا سا داغ لگ گیا۔ اخبار لے جاتے ہوئے اُس نے صرف اتنا کہا "میرا بیٹا اسلم بڑا نیک بچہ تھا۔ اُس کا دل تو سونے کا تھا۔ نہ جانے کیوں غریب نے یہ بیوقوفی کی؟ پھر ہتھیلی کی پشت سے اپنی آنکھ سے ڈھلکتے آنسو کو پونچھا۔

اخبار والا دیر تک لعل کی طرف دیکھتا ہی رہا۔ سفید بال، دُبلا پتلا جسم، گالوں کی ہڈیاں بڑھی ہوئیں، نیچے گری ہوئی سفید مونچھیں۔ ننگے پاؤں، ہاتھ میں اخبار لئے تیز تیز قدم اٹھاتا لعل برآمدے کی طرف بڑھا جہاں مالک گُم سُم بیٹھا آسمان کی طرف گھور رہا تھا۔

اخبار والے نے اپنی سائیکل سنبھالی اور سوار ہوتے ہوئے سوچنے لگا۔

"بوڑھے لعل کو اُس لڑکے سے کتنی محبت تھی۔ وہ کتنا وفادار نوکر ہے۔ کاش سارے ہی نوکر لعل کی مانند ایماندار اور وفادار ہوں!!!"

لعل نے بڑے ادب سے مالک کو اخبار دی۔ اُن کی حالت دیکھ کر تو لعل سانس لینا بھی بھول گیا۔ وہ بالکل خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ بیگم صاحبہ نے باہر آنے سے انکار کر دیا تھا اور اپنے کمرے میں ہی تھیں۔ تپائی پر چائے کی پیالی نہ جانے کب کی بنی پڑی تھی لیکن انہوں نے اُسے ہاتھ تک نہ لگایا تھا۔ روٹی بھی ویسے ہی پڑی ہوئی تھی۔ لعل کا ہزار دل چاہا کہ اپنے مالک سے کچھ کہے۔ لیکن اُسے اپنی سانس گھٹتی ہوئی معلوم ہوئی۔ اُس کے گلے میں جیسے پھندا لگ گیا ہو اور وہ اپنے مالک کی مزاج پُرسی تک نہ کر سکا۔ آنسوؤں سے آنکھیں دھندلانے لگیں تو وہ اخبار اُنہیں تھما کر، سر جھکائے اُلٹے پاؤں واپس مڑ آیا۔

ایک سرد آہ لیتے ہوئے وہ باورچی خانہ کی طرف بڑھا۔ اُسے معلوم تھا کہ اُس کی بیوی شریفہ وہاں ہی ہو گی۔ آہستہ آہستہ اُس نے جالی کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوا۔ دروازے کا سپرنگ ذرا سخت تھا۔ اِس لئے دروازہ اُس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور دھڑ کر کے زور سے بند ہوا۔ اُس کی طرف شریفہ کی پیٹھ تھی اور وہ گھی میں ڈبل روٹی تل رہی تھی۔ دروازے کے دھماکے سے وہ چونک پڑی اور چھن سے چمچ زمین پر جا گرا۔ وہ بھی اسلم کے خیال میں ہی ڈوبی ہوئی تھی اور دروازہ کھلنے کی آواز کو سُن تک نہ سکی تھی۔

بوڑھیا نے اپنی دھنسی ہوئی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے اپنے خاوند کو گھورا۔ مہندی لگے سرخ بالوں کی لٹ کو اپنے کان کے پیچھے کرتی ہوئی، دونوں ہاتھ جوڑ کر لعل کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "سارے گھر پر تو مُردنی چھائی ہوئی ہے اور یہ نواب دھڑ دھڑ دروازے مار رہا ہے۔ ارے بابا تجھے اور کوئی کام نہیں ہے؟ تجھے تو نہ جانے کس بات کی خوشی چڑھی ہوئی ہے۔"

لیکن تعل کی آنکھوں سے دو موٹے موٹے آنسو فرش پر گرے۔ ایک آہ بھر کر وہ زمین پر بیٹھ گیا۔ "آج پھر انگریزی پوڑے تل رہی ہو؟ میں ابھی ابھی برآمدے کی طرف سے آرہا ہوں۔ مالک کو اخبار دینے گیا تھا۔"

تعل نے اپنی پگڑی اتار کر فرش پر رکھ دی اور زور زور سے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "ہائے میرا مالک۔"

تعل کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر شریفہ کا غصہ جاتا رہا۔ اس نے توے پر فرنچ ٹوسٹ پلٹتے ہوئے کہا۔

"ثریا مس صاحبہ نے ناشتہ پلنگ میں ہی مانگا ہے۔ اور حکم دیا تھا کہ ان کے لئے فرنچ ٹوسٹ بنائے جائیں۔ اس لئے وہ بنا رہی ہوں۔ وہ تو یہاں پوری طرح چھٹی گذارنا چاہتی ہے۔ کالج اور ہسپتال میں شاید اسے بہت کام کرنا پڑتا ہے۔"

"اری شریفہ، کیا نام لیا تو نے ان انگریزی پوڑوں کا؟ یہ بنتے کس چیز سے ہیں؟" تعل نے توے کی طرف دیکھا۔

"انڈے کو دودھ میں پھینٹتے ہیں اس کے بعد ڈبل روٹی کو اس میں اچھی طرح بھگو کر گھی میں سرخ کر لیتے ہیں۔ بس فرنچ ٹوسٹ تیار ہیں۔"

"نہ بابا نہ، یہ گلگلے صبح ہی صبح کیسے اچھے لگتے ہوں گے۔ کیا بات ہے تازہ سینکی ہوئی روٹی کی جس پر گھی لگا ہوا ہو!!"

"واہ جی واہ باتیں تو ایسی ملاتے ہو جیسے اس گھر کے ہیڈ باورچی تو تم ہی ہو۔ چلو اپنا کام کرو۔ ثریا مس صاحبہ یہ پسند کرتی ہیں، پھر مجھے حکم ہے کہ انہیں پلنگ میں ہی ناشتہ ملے اور یہ بھی حکم دیا تھا کہ ان کے لئے آٹھ فرنچ ٹوسٹ بنائے جائیں۔ نہ معلوم وہ کس پیٹ میں ان سب کو ٹھونسے گی۔ خیر جو حکم ہے

وہ سر آنکھوں پر..... لیکن سارا گھر تو بیٹا اسلم کے جانے سے رو رہا ہے اور یہ..... چلو خیر اُس کی مرضی"

پگڑی سنبھالتے ہوئے لعل نے کہا۔" میں سمجھتا ہوں۔ وہاں مالک برآمدے میں اکیلے بیٹھے ہیں۔ ایک گھونٹ چائے تک نہیں پی۔ مالکن الگ اندر چارپائی سے لگی پڑی ہیں۔ لیکن یہ ثریا....."

"چپ رہ اوئے بڈھے۔ اب خاموش ہوتا ہے یا نہیں"

شریفہ ایک ٹرے میں پرچ پیالی، دودھ دان، چینی دان لگا کر لائی۔ پھر چائے دانی پر اونی غلاف چڑھا دیا۔ ایک پلیٹ میں آٹھ فرنچ ٹوسٹ رکھے دو اُبلے ہوئے انڈے اور نمک بھی ٹرے میں رکھا۔

"کیوں بوڑھے میاں۔ اگر تمہاری ماں مر جائے تو کیا تم اُس دن اتنا کھا سکو گے؟" مالکن بیچاری تو سوکھ کر کانٹا ہوئی جا رہی ہے لیکن ہماری ڈاکٹر مس صاحبہ کو کیا فکر۔ وہ تو بے فکر ہو کر کھاتی ہے اور سوتی ہے اور بس..... ایک دن وہ بھی تھا کہ میری مالکن شکایت کیا کرتی تھیں کہ پھول کر کپا ہو رہی ہیں، لیکن آج تو سوکھی لکڑی کی مانند ہو کر رہ گئی ہیں"

"شریفہ۔ میری ایک بات تو مان" لعل نے اپنی بیوی کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔" کوئی چارہ کر کہ مالکن کے حلق سے بھی کچھ اترے۔ اس طرح تو وہ اپنے کو کوئی بیماری لگا لے گی"

شریفہ نے ایک ہاتھ میں ٹرے اور دوسرے میں فرنچ ٹوسٹ والی پلیٹ اٹھائی اور سر ہلا کر لعل کو اشارہ کیا کہ احتیاط سے دروازہ کھولے۔ پھر ثریا کے کمرے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔" میں اُن کے لئے بھی یہی بناتی ہوں۔ شاید کچھ کھا لیں"

اُسی وقت لعل کو اپنے مالک کی آواز آئی جو زور زور سے اُسے پکار رہا تھا کہ باہر کا دروازہ کھولے۔ مالک اپنی موٹر میں کہیں باہر جا رہے تھے۔ لعل تیزی سے پھاٹک کی طرف لپکا۔ جالی میں سے شریفہ لعل کو بڑے بے ڈھنگے طریقے سے بھاگتے دیکھ کر مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔ لعل ایک ہاتھ سے اپنی پگڑی درست کر رہا تھا اور دوسرے سے اُس نے اپنی دھوتی سنبھالی ہوئی تھی جو شاید کھل گئی تھی۔ کیونکہ وہ زمین پر گھسٹتی چلی جا رہی تھی اور اُس کے پاؤں میں بار بار اُلجھتی تھی۔

شریفہ گول کمرے سے ہو کر ثریا کے کمرے کی طرف جا رہی تھی کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ ثریا بڑی تیزی سے اپنا دروازہ کھول کر باہر نکلی اور شریفہ سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔ اُس نے لمبا ریشمی کوٹ پہنا ہوا تھا اور پاؤں سے ننگی تھی۔ بغیر سوچے سمجھے اُس نے کہا "اندھی، نظر نہیں آتا پڑے میرے کمرے میں رکھ دو۔ میں فون سُن کر ابھی آتی ہوں۔"

شریفہ کا دل بیٹھ گیا۔ خاموشی سے وہ ثریا کے کمرے میں داخل ہوئی۔ افسردہ نظروں سے کمرے کا جائزہ لیا۔ ہر چیز بکھری پڑی تھی۔ میز پر ناولوں کا انبار لگا ہوا تھا۔ راکھ ڈالنے والی طشتری میں سگریٹ کے جلے ہوئے ٹکڑے بھرے پڑے تھے۔ سنگار میز پر بوتلیں ہی بوتلیں تھیں۔ پوڈر کے ڈبے۔ ہونٹوں اور ناخنوں پہ لگانے والی پالش کی شیشیاں ہی شیشیاں نظر آتی تھیں۔ فرش پر ڈھیر ساری گندی لتھڑی ہوئی روئی پڑی تھی جس سے ثریا نے اپنے چہرے پہ لگی ہوئی سُرخی پوڈر پونچھی تھی۔ پلنگ کے پاس ہی زمین پر کوکا کولا کی خالی بوتلیں پڑی ہوئی تھیں۔ شریفہ نے بوتلیں اور روئی سمیٹی کہ اس سے کمرے کی کچھ تو گندگی کم ہو۔ وہ کمرے سے باہر آئی تو اُس نے ثریا کو فون پر

زور زور سے باتیں کرتے دیکھا۔ وہ سمجھی شاید کسی نے اسلم کے بارے میں کوئی خبر دی ہے جس کی وجہ سے ڈاکٹر مس صاحبہ اتنی اونچی اونچی آواز میں باتیں کر رہی ہے۔ گول کمرے کا دروازہ اُس نے پورا بند نہ کیا بلکہ ذرا سا کھولا رکھا اور کان لگا کر اُسکی باتیں سننے لگی۔

"گڈ گڈ۔ یہ پروگرام تو بہت ہی بہتر رہے گا۔ میں ضرور تمہارے ساتھ مری جاؤں گی۔ یہاں تو پڑی پڑی سڑ رہی ہوں اور اپنی قیمتی چھٹیاں برباد کر رہی ہوں ..... بھائی؟ ..... ارے چھوڑو اُس کی بات نہ کرو۔ وہ تو ہماری اتنی بے عزتی کا باعث بنا ہے ..... تمہارے امی ابو بھی ساتھ ہوں گے نا ..... واہ مزا ہی آجائے گا ..... اچھا پیاری گلو۔ میں تیار رہوں گی ..... ٹھیک ہے نا۔ کل صبح چھ بجے چلیں گے۔ اچھا خدا حافظ۔ بائے ناز لی"

یہ بات چیت سن کر شریفہ سکتے میں آگئی اور دروازے کے پاس سے ہٹنا ہی بھول گئی۔ اتنے میں ثریا نے آکر زور سے دروازہ دھکیا۔ تو دروازے کے پٹ ٹھاخ سے شریفہ کے منہ پر لگے۔ یہ دیکھ کر ثریا کا پارہ چڑھ گیا اور وہ شریفہ کو بکنے لگی۔

جس جگہ اُسے سر میں دروازہ لگا تھا اُسے اپنے ہاتھ سے سہلاتی ہوئی شریفہ نے ثریا سے کہا۔

"بی بی جی۔ میں ہاتھ جوڑ کر منت کرتی ہوں کہ مری نہ جاؤ۔ تمہاری امی کے پاس کون رہے گا؟"

ثریا نے آنکھیں نکال کر کہا۔

"بکو مت۔ شریفہ تم اپنی حیثیت میں ہی رہو۔ تجھے کس نے مجھ پر گورنر

لگا دیا ہے۔ نوکروں کا یہ کام نہیں کہ وہ مالکوں کی باتیں سنیں یا اُن کی باتوں میں دخل انداز ہوں۔ سن لیا نا۔ اب دفع ہو جاؤ میری نظروں کے سامنے سے۔"

بچاری شریفہ ..... خالی بوتلیں اُٹھائے باورچی خانہ میں آگئی۔ اندر وہ فرش پر ہی بیٹھ گئی اور دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھام لیا۔ بھلا وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔ کیا وہ اپنے خاوند سے بات کرے؟ اُس نے نعمل کو ہاتھ کے اشارے سے اندر بلایا۔ نعمل اُس وقت پھر باڑھ چھانٹنے میں مصروف تھا۔ قینچی ہاتھ میں لئے وہ باورچی خانہ میں آگیا اور بڑے غور سے اپنی بیوی کی آنکھوں کی طرف دیکھنے لگا جن سے آنسو بہہ رہے تھے۔ شریفہ نے اُسے ساری بات سنائی اور منت کر کے کہا۔

"خدا کے لئے نعمل کوئی تجویز نکالو کہ ہم اِس غمزدہ خاندان کی بہتر خدمت کر سکیں۔"

لیکن نعمل نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "پگلی۔ بھلا ہم نوکروں کی تجویز ماجزادی کبھی مانے گی؟"

"بی بی ٹھیک کہتی ہے تمہیں اپنی حیثیت ضرور پہچاننی چاہیئے" پھر کچھ سوچ کر کہا۔ "تو بی بی کے بارے میں نہ سوچ۔ مالکن کی طرف دیکھ اور اُس کی فکر کر۔ کوشش کر کہ وہ ناشتہ کر لیں اور اُن کی خوراک کا سب سے زیادہ خیال رکھ۔ بس انہیں یہ یقین دلا کہ اسکم بیٹا آج یا کل بس آنے ہی والا ہے۔ وہ تو اب اِسی بات کے سہارے جیتی ہیں۔"

پھر کمر سیدھی کرتے ہوئے بولا۔ "میں مالک کی دیکھ بھال کروں گا۔ اِسی طرح ہم دونوں ہی اِس غم کی گھڑی میں اُن کا پورا پورا ساتھ دیں گے۔"

دوسرے دن صبح ہی صبح نیلے رنگ کی بڑی سی ڈبانما موٹر مری کی طرف جا رہی تھی۔ موٹر میں ثریا اُس کی دوست اور اُس کا سارا خاندان سوار تھا۔ یہ دونوں سہیلیاں بیچ والی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ اِس وقت ثریا اپنی باتوں سے سب کو خوب ہنسا رہی تھی۔

نازلی کا بھائی ارشد سب سے پچھلی سیٹ پر اکیلا ہی بیٹھا ہوا تھا۔ ارشد بی اے کر چکا تھا اور اب ایم اے میں تھا۔ فطرتاً وہ خاموش طبیعت اور تنہائی پسند تھا اِس لیئے جلد ہی لڑکیوں کی باتوں سے دل برداشتہ ہوگیا۔

اس لیئے اُس نے اپنی جیب سے اردو ڈائجسٹ رسالہ نکالا اور جاسوسی کہانی پڑھنے لگا۔

مسٹر قریشی نازلی کے ابّا موٹر چلا رہے تھے اور اُن کے ساتھ والی نشست پر اُن کی بیگم بیٹھی ہوئی تھیں۔

قریشی صاحب نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھا "وقت تو ہمارے پاس کافی ہے ابھی ساڑھے بارہ بجے ہیں۔ میرا خیال ہے پندرہ بیس منٹ میں ہم مری پہنچ جائیں گے میری تجویز یہ ہے کہ مری پہنچتے ہی سب سے پہلے ہم ویلی ویو ہوٹل میں روٹی کھائیں۔ اِس کے بعد سیر کریں گے۔

بیٹا ارشد تم ان لڑکیوں کے ساتھ جانا"

ارشد نے بے دلی سے لڑکیوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

"میں ان کا چوکیدار تھوڑا ہی ہوں۔ میں نے تو چند چیزیں خریدنی ہیں"

لڑکیوں نے ارشد کی طرف منہ چڑاتے ہوئے کہا "تھانیدار صاحب۔ ہم نے بھی چیزیں خریدنی ہیں۔ ہم تو آپ کے ساتھ ہی جائیں گی"

"پہلے ہم ویلی ویو جا رہے ہیں، وہاں کھانا کھائیں گے"

"واہ واہ - واہ واہ - بھوک سے تو میری جان نکل رہی ہے - مرغ مسلم - پلاؤ بریانی - ہائے منہ میں پانی آرہا ہے" ثریا نے تالی بجاتے ہوئے کہا۔

ارشد نے پیچھے بیٹھے بیٹھے کہا "یہاں تو کوئی رونق ہی نہیں ہے مال روڈ تو بالکل سنسان ہے - شاید یہاں کوئی آیا نہیں ہے"

قریشی صاحب نے ہوٹل کے میدان میں موٹر روکی - بڑی بڑی شیشے والی کھڑکیاں جن میں سنہری پردے لگے ہوئے تھے، دیکھ کر ثریا بڑی حیران ہوئی۔

"اوئی ربا! کتنی پیاری لگ رہی ہیں - آؤ نازلی - جلدی جلدی اندر چلیں"

قریشی صاحب ابھی موٹر بند کر رہے تھے اور بیگم قریشی اپنے منہ پر پوڈر لگا رہی تھیں - ارشد دونوں لڑکیوں کے پیچھے پیچھے اندر داخل ہوا، تاکہ کوئی خالی میز تلاش کرلیں جہاں سے وہ باہر مری کا اچھی طرح نظارہ کر سکیں - ابھی وہ اندر داخل ہوئے ہی تھے کہ نازلی کو یاد آیا کہ وہ اپنا بٹوہ تو موٹر میں ہی بھول آئی ہے۔ اس لئے بڑی تیزی سے باہر موٹر کی طرف بھاگی - اب ارشد اور ثریا وہاں اکیلے رہ گئے تھے - جب وہ دونوں ہال کمرے میں داخل ہوئے تو ثریا ارشد کی طرف دیکھ کر مسکرائی اور اُسے اندر چلنے کے لئے کہا، اُن کا خیال تھا شاید ہال میں بہت سے لوگ بیٹھے کھانا کھا رہے ہوں گے - لیکن یہاں تو بات ہی کچھ اور تھی - ایک کونے میں صرف دو آدمی کھانا کھانے میں مصروف تھے اور ایک دوسری میز پر ایک اور خاندان - بیرے یونہی اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے یا بیکار کھڑے ہوئے تھے - اب ثریا نے بڑی مایوسی سے ارشد کی طرف دیکھا اور ارشد نے جھک کر اُسے آگے بڑھنے کو کہا۔

عین اُسی وقت کونے والے دو آدمیوں میں سے ایک کود کر کھڑا ہوگیا۔ تیز تیز قدم اُٹھاتا اُن دونوں کی طرف آیا اور ہوا میں مُکّے لہرانے لگا۔

یہ دونوں بُت بنے کھڑے تھے کہ اُن سے قصور کیا ہوا ہے۔ ارشد اگرچہ ذرا ڈرپوک قسم کا انسان تھا لیکن وہ جھٹ ثریا کے سامنے کھڑا ہو گیا اور مقابلے پر ڈٹ گیا۔

ثریا بھی گھبرا تو ضرور گئی تھی لیکن اب سنبھل چکی تھی۔ سفید ڈاڑھی مونچھوں والا ایک بزرگ انسان اُس کے سامنے مُکّے تانے کھڑا تھا اور کھا جانے والی آواز میں چلّا رہا تھا۔

"تو یہاں اس آوارہ چھوکرے کے ساتھ کیا کر رہی ہے؟ یوں اکیلی غیر مردوں کے ساتھ پھرتے تجھے شرم نہیں آتی؟"

ہر ایک ان ہی کی سمت دیکھ رہا تھا۔ چارلی بھی اُٹھ کر جلدی سے اپنے ساتھی کی طرف بڑھا اور اسلم کے کندھے کو زور سے ہلاتے ہوئے بولا۔

"پروفیسر صاحب۔ ہوش میں آئیں۔ آپ کو سخت غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہوش میں آئیں پروفیسر احسن"

اسلم کو ایک دم احساس ہوا کہ چارلی ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اُس نے اپنا ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھا اور ملتے ہوئے ایسے ظاہر کیا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہے پھر ادب سے سر جھکا کر بولا۔

"محترمہ۔ مجھے معاف کر دیجئے۔ مجھ سے بڑی فحش غلطی سرزد ہوئی۔ میں معافی کا خواستگار ہوں"

یہ کہتے کہتے وہ پیچھے سرکتا گیا اور پھر تیزی سے باہر اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ اُس نے بالکل مناسب نہ جانا کہ وہ اپنی بہن کے سامنے ایک منٹ بھی اور رُکے۔ اُس کا سر چکرا رہا تھا اور اُس کے اوسان خطا ہو چکے تھے۔ اُس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کہ وہ کیوں اس طرح آپے سے باہر ہو گیا اور یہ خطرناک

حرکت کر بیٹھا۔

جب نازلی اپنے والدین کے ساتھ اندر آئی تو اُس نے خوش پوش چارلی کو ثریا اور ارشد کے ساتھ باتیں کرتے دیکھا۔ چارلی انہیں اپنے دوست کے بارے میں ایک بڑی ہی رنجیدہ کہانی سنا رہا تھا کہ اُس کا بدبخت دوست احسن جو چیف کالج کا پرنسپل ہے اپنی ایک ہی بہن کے اُس کے خانسامے کے لڑکے کے ساتھ بھاگ جانے کے بعد ذہنی توازن کھو بیٹھا ہے۔ اِن محترمہ کو دیکھتے ہی اُس پر جنون سوار ہو گیا اور پاگل پن میں انکی بے عزتی کا باعث بنا۔ پھر ہاتھ جوڑ کر ثریا سے معافی مانگی اور کوشش کی کہ اُس کے پاؤں چھوئے لیکن ثریا کود کر پیچھے ہٹ گئی۔

چارلی نے سیدھے کھڑے ہو کر مسکراتے ہوئے اُس کی طرف دیکھا تو ثریا نے بڑے ادب سے اُس سے کہا۔ "مجھے آپ کے دوست کی حالت دیکھ کر دلی صدمہ ہوا ہے۔ مہربانی سے آپ اُن کا خیال رکھا کریں۔"

قریشی صاحب خاندان سمیت ایک میز کے چوگرد بیٹھ گئے اور چارلی اپنی اُسی جگہ آ بیٹھا اور اپنے سامنے اخبار کر لیا۔ چونکہ یہ چارلی کی میز سے کوئی زیادہ دُور نہ تھے اِس لئے وہ اُن کی بات چیت بخوبی سُن سکتا تھا۔ جب انہوں نے بیرے کو کھانا لانے کا آرڈر دے دیا تھا تو ثریا نے سارا واقعہ نازلی اور اُس کے والدین کو بتایا کہ کس طرح ایک بیچارہ پروفیسر اپنی بہن کے بھاگ جانے سے پاگل سا ہو گیا ہے۔ چارلی غور سے ساری باتیں سن رہا تھا۔ ثریا کہہ رہی تھی۔

"انکل میری سمجھ میں ایک بات نہیں آتی۔ اُس بوڑھے پروفیسر کا قد کاٹھ بالکل میرے نالائق بھائی اسلم جیسا تھا۔ جب وہ میرے سامنے دھاڑ رہا تھا تو وہ مجھے بالکل اسلم جیسا لگ رہا تھا۔ اور کوئی مشابہت ہو نہ ہو۔ لیکن

آواز تو بالکل اسلم کی ہی تھی۔"

چارلی صاحب کا سانس اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔

ارشد نے اپنی پلیٹ میں چاول ڈالتے ہوئے کہا۔

"اگر وہ آپ کا بھائی تھا تو کیا ایک ہفتہ میں ہی وہ بوڑھا بھی ہو گیا ہے؟ اُس پروفیسر کا سر تو کیا ڈاڑھی اور مونچھیں بھی سفید تھیں۔" اور پھر اُسے چھیڑتے ہوئے کہا۔ "آپ کا چھوٹا بھائی اور عمر میں آپ سے پچاس سال بڑا۔ ہا ہا ہا ہا۔"

"نام نہ لو ارشد اُس ذلیل انسان کا۔ نہ جانے کہاں دفع ہو گیا ہے۔ کاش وہ پیدا ہوتے ہی مر جاتا تو ہمارے لئے جگ ہنسائی کا باعث تو نہ بنتا۔"

اب تو چارلی کو بھی تسلی ہو گئی کہ وہ اسلم کو پہچان نہیں سکے ہیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ آئندہ وہ اسلم کے بارے میں بڑا ہی ہوشیار رہے گا کیونکہ اُس کی اس قسم کی حماقت سے اُس کا سارا بنا بنایا کھیل ہی بگڑ سکتا ہے۔ آئندہ اُسے اپنی آواز پر بھی بڑا قابو پانا ہوگا۔ کیونکہ ایک یہ بھی اُس کی کمزوری ہے۔ وہ خاموشی سے اٹھا۔ غسل خانہ میں گیا اور پچھلا دروازہ کھول کر ہوٹل کے باورچی خانہ سے ہوتا ہوا اپنے کمرے میں آ گیا۔

اسلم خاموش آرام کرسی پر لیٹا ہوا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ چارلی آتے ہی اُس پر برس پڑے گا۔ لیکن ایسا نہ ہوا بلکہ چارلی نے بڑے تحمل سے اُس سے بات کی۔

"واقعی احسن! میں سچ مچ تمہاری تعریف کرتا ہوں کہ تم نے اپنے کو بڑا قابو میں رکھا۔ اگر تمہاری جگہ میں ہوتا تو شاید دونوں کو گولی مار دیتا۔ غیر مرد کے ساتھ اپنی بہن کو دیکھ کر بھلا کون برداشت کر سکتا ہے۔ چلو اب بھول جاؤ۔ یہ لو۔ ٹھنڈی ٹھنڈی سیون اپ پی لو۔"

وہ دونوں سارا دن اپنے کمرے سے باہر نہ نکلے اور چارلی بار بار کھڑکی سے اُس موٹر کو دیکھتا رہا اور جب تک وہ موٹر مری سے پنڈی کی طرف روانہ ہو گئی ایک آدمی شام تک اُس کے پیچھے پیچھے لگا رہا۔

ہوٹل کے کمرے میں چارلی اور اسلم ساری دوپہر تاش کھیلتے رہے۔ ساتھ ساتھ چارلی اپنے غیر ملکوں کے سفر، وہاں کے مختلف لوگوں، اُن کے مذہب، طور طریقے، رسم و رواج اور بہت سی دوسری باتیں اُسے سناتا رہا۔

کچھ دیر بعد اسلم نے اُس سے پوچھا۔ چارلی صاحب آپ تو پکے مسلمان ہیں نا؟"

"ہاں۔ میں ایک مسلم خاندان میں پیدا ہوا تھا۔ لیکن مجھے یہ بتانے میں کوئی شرم نہیں ہے کہ میں مذہب سے ہمیشہ دُور ہی رہا ہوں۔ میں تو یہ مانتا ہوں کہ کھاؤ پیئو اور عیش کرو۔ ارے وہ کتنے احمق ہیں جو سارا دن رب رب کرتے رہتے ہیں اور اس کے سوا انہیں اور کوئی کام نہیں۔ بھلا کبھی کسی نے خُدا کو بھی دیکھا ہے؟"

اسلم بڑا بے چین نظر آ رہا تھا۔ چارلی ہوا میں دھوئیں کے گولے بنانے میں مصروف تھا۔

"لیکن چارلی۔ دنیا میں ایسے لوگ بھی تو ہیں جن کی قسمت میں دُکھ ہی دُکھ لکھا ہے۔ اُس آدمی کا سوچو جو ایک مہلک بیماری میں پڑا تڑپ رہا ہے۔ ننھے ننھے بچے بھی بھوک پیاس یا بیماری سے تڑپ تڑپ کر مر جاتے ہیں۔ پھر غریب ہیں جو رات دن محنت مزدوری کرتے ہیں۔ لیکن انہیں کھانے کو پھر بھی کچھ نہیں ملتا اور فاقے کرتے ہی اُن کی عمر بیت جاتی ہے۔"

چارلی نے سگریٹ کا لمبا سا کش کھینچا اور بولا۔ "واقعی زندگی کا ایک

رُخ ایسا بھی ہے۔ لیکن مولانا۔ اِس سے ہمیں کیا واسطہ۔ تم بھی یہ خیالات اپنے دل و دماغ سے نکال دو۔ میری صلاح تو یہ ہے۔ اس دنیا میں جتنی ہو سکے عیش کرو۔ کون جانتا ہے کہ موت کے بعد کیا ہوگا؟ موت کے بعد تو سارا کھیل ہی تمام ہو جاتا ہے میرے بھائی۔"

پھر سگریٹ کو فرش پر جوتی سے مسلتے ہوئے کہا۔ "تم نے وہ انسانی ڈھانچے تو دیکھے ہوں گے جو صدیوں بعد کھود کر نکالے گئے تھے۔ کبھی اُن پر گوشت پوست تھا۔ لیکن اب وہ کچھ بھی نہیں ہے۔"

پھر ایک انگڑائی لے کر اٹھتے ہوئے بولا۔

"میرے دوست یہ موت، یہ آخرت، یہ قیامت یہ سب فضول باتیں ہیں اور نہ ہی میں اُن کو مانتا ہوں۔" چارلی نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھا۔ چھ بج رہے تھے۔ "منہ دھو کر آتا ہوں۔ بکچر کا وقت ہو گیا ہے۔" چارلی غسل خانہ میں گھس گیا لیکن اسلم بڑی دیر تک چارلی کی ایک ایک بات کو اپنے ذہن میں دہراتا رہا۔ پھر وہ بھی کھڑا ہو گیا اور بولا۔

"مسٹر چارلی درست فرماتے ہیں۔"

اسلم نے ریڈیو چلایا تو ایک فلمی گانا آ رہا تھا۔

"کس کو پتہ ہے کل آئے کہ نہ آئے۔ اے میری زندگی"

باب ۵

اگلے دن بڑی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ رات بھر بارش ہوتی رہی تھی اور اولے بھی پڑے تھے۔ بادلوں کی گرج، بجلی کی چمک اور ہوا کے شور سے اسکم بالکل سو نہ سکا تھا۔ نہ جانے کب اُس کی آنکھ لگی تو کسی کمرے کا دروازہ بڑے دھماکے سے بند ہوا اور اُس کی پھر آنکھ کھُل گئی۔

رات ختم ہونے میں ہی نہ آتی تھی۔ عجیب عجیب خیالات اُسے ڈرا رہے تھے۔ اپنے دوست کے بغیر وہ اکیلے میں بڑا گھبرا رہا تھا۔ چارلی بھی اُسے چھوڑ کر چلا گیا۔ رات دس بجے اُسے کوئی بلانے آیا تھا کہ اُس کی بہن کی حالت بڑی خراب ہے اس لئے وہ اُس کے پاس چلا گیا تاکہ اُسے گھر پہنچا دے۔ جاتے جاتے چارلی اُسے تاکید کر گیا تھا کہ اُس کے لئے یہ بہتر ہوگا کہ وہ پورے ایک ہفتہ تک اسی ہوٹل میں رہے۔ ایک ہفتہ کے بعد وہ بس کے ذریعہ پنڈی سے پشاور جائے اور پھر غیر علاقہ کی طرف آجائے۔ چارلی نے اُسے اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ لنڈی کوتل سے ایک میل پہلے ریل کا ایک پھاٹک ہے، اُس جگہ وہ بس سے اتر جائے اور ریل کی پٹڑی کے ساتھ ساتھ جو کچا راستہ ہے اُس پر چلتے ہوئے وہ ایک تنگ سی گھاٹی میں داخل ہوگا۔ وہاں وہ پہاڑی راستہ

پر چڑھنا شروع کر دے۔ موڑ مڑتے ہی اُس کو ایک حویلی نظر آئے گی۔ وہ بیت القمر ہے وہی چارلی کی رہائش گاہ ہے۔

چارلی نے بار بار اُسے تاکید کی تھی کہ وہ ہر بات بڑی خفیہ رکھے۔ اسلم حیران ہو رہا تھا کہ چارلی کتنا عقل مند ہے کہ ہر بات پہلے سے سوچ لیتا ہے۔ اُس نے اسلم کو سمجھا دیا تھا کہ اگر وہ ایک عام بس میں سفر کرے گا تو پولیس کبھی اُس پر شک کر ہی نہ سکے گی۔ پھر اُس نے اپنا حلیہ بھی بدلا ہوا ہوگا اِس لئے اسلم کو کسی طرح بھی ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ جانے سے پیشتر چارلی نے ایک ہفتہ کا کرایہ بھی پیشگی ادا کر دیا تھا اور نقد تیس روپیہ بھی اُس کو دے دیا کہ یہ اُس کے سفر میں کام آئے گا۔

چارلی کو اُس پر اب کتنا اعتماد تھا اِسی لئے تو اُس نے یہ سارے انتظام کر دیئے تھے۔ تسلی دیتے ہوئے چارلی نے اُس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ہر شام ۹ بجے اُسے فون کر کے اُس کی خیر خبر دریافت کرتا رہے گا۔

اِس وقت اسلم کمرے میں اکیلا تھا۔ بار بار اُس کے ذہن میں یہ خیال آتا کہ اب بھی وقت ہے کہ وہ واپس اپنے گھر چلا جائے۔ لیکن نہیں۔ چارلی نے اُسے یہ بتایا تھا کہ ہوٹل میں ثریا نے اُسے بیوقوف، بیغیرتی کا باعث، گدھا اور نہ جانے کیا کیا کہا تھا۔ اب وہ انہیں دکھا دے گا کہ اُس میں بھی اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی قابلیت ہے۔ اب تو وہ کسی قیمت پر بھی چارلی سے بے وفائی کرنے کو تیار نہ تھا جو اُس پر مکمل اعتماد کرتا تھا اور جس نے اُس پر اتنی زیادہ رقم بھی خرچ کی تھی۔ نہ جانے کب اُس کی آنکھ لگ گئی۔

صبح وہ ناشتہ کے لئے میز پر بالکل تنہا بیٹھا ہوا تھا۔ اُسے اپنے دوست کی غیر حاضری بُری طرح محسوس ہو رہی تھی کیونکہ وہ اُسے نت نئے لطیفے

سُنایا کرتا تھا۔ اُس نے اخبار پڑھنے کی کوشش کی لیکن اِس میں بھی اُس کا دل نہ لگا۔ اب وہ اپنے دل میں پروگرام بنانے لگا کہ آج کا دن کس طرح گذارا جائے۔ وہ آہستہ آہستہ چائے پی رہا تھا۔ اُس نے ایک لڑکے کو دیکھا جو شاید اُس کا ہی ہم عمر تھا۔ وہ بڑی پھُرتی سے ہال کمرے میں اِدھر اُدھر آجا رہا تھا۔ اسلم نے دو ایک مرتبہ پہلے بھی اِس لڑکے کو دیکھا تھا۔ نہ جانے کیوں وہ اُسے اچھا لگنے لگا تھا۔ وہ بہت ہوشیار اور چالاک لیکن ساتھ ہی دیانتدار بھی نظر آتا تھا۔ اِس وقت وہ کل والے اخبار جمع کر رہا اور اُن کی جگہ تازہ اخبار رکھ رہا تھا جب وہ اُس کی میز کے قریب آیا تو بڑی خندہ پیشانی سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "صبح بخیر محترم۔ آج آپ بڑی جلدی بیدار ہو گئے؟"

اسلم اُس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔ چائے کے بغیر وہ اپنے کو تنہا محسوس کر رہا تھا اور کسی سے بات چیت کرنے کا خواہشمند تھا۔ "موسم بڑا خراب تھا۔ میں بالکل سو نہ سکا۔ تم یہاں کیا کرتے ہو؟ کیا اپنی چھٹیوں میں نوکری کر کے کچھ پیسہ کمانا چاہتے ہو؟"

"جی۔ آپ نے بالکل ٹھیک کہا۔ میں نے اِس سال دسویں جماعت کا امتحان پاس کیا ہے۔"

"لیکن میں تو فے ۔ ۔ ۔ ۔" اسلم نے ایک دم اپنی آواز روک لی اور جلدی سے چائے کا ایک گھونٹ لیا اور بولا "میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میرا بھانجا اس سال فیل ہو گیا ہے۔ بچارہ بچّہ۔ اس دفعہ تیسری بار فیل ہوا ہے۔"

اسلم کی ہنسی بڑی پھیکی سی تھی۔

"لیکن میں تو فرسٹ ڈویژن میں آیا ہوں۔" اُس لڑکے کی آواز میں جوش اور مسرت تھی۔

"اب تمہارے کیا ارادے ہیں؟" اسلم کو اس لڑکے پر بڑا رشک آرہا تھا کہ اُس کا نتیجہ کتنا شاندار تھا۔

"میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔" لڑکے کی آنکھیں فرش پر جمی ہوئی تھیں "میری والدہ بیوہ ہیں۔ اس لئے میں کام دھندہ کر کے کچھ کماتا ہوں۔ اس وقت مجھے فرصت تھی۔ اس لئے اِس ہوٹل میں بڑی معمولی سی نوکری کر رہا ہوں یعنی کسی کا خط ڈاک میں ڈال دینا۔ کسی کی کوئی چیز لا دینا اور ایسے ہی چھوٹے موٹے کام میں گرمیوں کی چھٹیوں میں یہاں آجاتا ہوں اور ہر سال مجھے اس ہوٹل میں یہ کام مل جاتا ہے۔ خیر بعد میں دیکھا جائے گا کہ آئندہ کیا کروں گا۔"

اسلم دیکھا کرتا تھا کہ یہ لڑکا کتنے انہماک سے کام کیا کرتا تھا۔ اُسے اِن چھوٹے موٹے کاموں کے کرنے میں کوئی شرم محسوس نہ ہوتی تھی اور نہ ہی وہ انہیں اپنی بےعزتی کا باعث سمجھتا تھا۔ وہ کس قدر مطمئن اور خوش تھا۔ اسلم کے ذہن میں یہ خیال دوڑا۔ "اگر میں پہلے والا اسلم ہوتا تو اِس لڑکے کو ضرور اپنا دوست بنا لیتا۔"

جھاڑن سے منہ پونچھتے ہوئے اُس نے لڑکے سے پوچھا "تمہارا نام کیا ہے؟"

"نام تو میرا اندریاس مسیح ہے لیکن سکول میں میرا نام اینڈی پڑ گیا اور اب سب مجھے اسی نام سے پکارتے ہیں۔"

"آ آ آ آ چھوں۔" زور سے اسلم چھینکا۔ اینڈی سامنے والی کھڑکی بند کرنے بڑھا جس سے ٹھنڈی ہوا اندر آرہی تھی۔ اتنے میں کسی نے اُس کا نام لے کر پکارا "اینڈی۔ تمہیں اندر بلا رہے ہیں۔

اینڈی۔ تمہیں اندر بلا رہے ہیں۔"

اینڈی جلدی جلدی اُس طرف بڑھنے لگا، لیکن جانے سے پہلے اُس نے

بڑی دوستانہ مسکراہٹ سے اسلم کی طرف دیکھا۔ نہ جانے کیوں اسلم اس لڑکے کی طرف کھنچنے سا لگا تھا۔

چائے سے فارغ ہو کر نو بجے اسلم ہوٹل سے باہر آیا کونے والی دکان سے اُس نے بڑا سا کالے رنگ کا چھاتہ خریدا اور اُسے چھڑی کی طرح گھماتا ہوا آگے بڑھا۔ اب وہ مال روڈ پر آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ موسم کافی خراب تھا اِس لیئے یہاں آئے ہوئے لوگ اپنے اپنے گھروں میں ہی دبکے بیٹھے تھے۔ اِس وقت بھی گھنگھور گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ ایسے دکھائی دیتا تھا کہ ابھی مینہ برسا کہ برسا۔ تیز ہوا کے جھونکے اُس سے ٹکرا رہے تھے۔ لیکن وہ اِن تمام باتوں سے بے خبر خراماں خراماں چلا جا رہا تھا۔ دائیں ہاتھ کی دکانیں چلغوزوں۔ باداموں اور کشمش سے اٹی پڑی تھیں۔ بائیں جانب کی اکثر دکانیں ابھی تک بند پڑی تھیں۔ شاید موسم کی خرابی کے باعث دکاندار ابھی نہیں آئے تھے۔ جو دکانیں کھلی تھیں اُن میں بھی دکاندار اپنی اپنی گدیوں پر یونہی بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن کے سامنے کانگڑیاں پڑی ہوئی تھیں اور وہ اپنے ہاتھ تاپ رہے تھے۔

نچلے بازار میں اُسے بابا نظر آیا جو درزی کی دکان میں بیٹھا حُقہ پی رہا تھا اور گپ شپ میں مصروف تھا۔ بابا اُسے دیکھ نہ سکا تھا۔ اس وقت اسلم کا دماغ تیزی سے کام کرنے لگ گیا، وہ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اُس جھونپڑی میں وہ لڑکی اب تک ہے یا نہیں۔

اُس نے لمبے لمبے قدم لیئے۔ شکر ہے کہ اب تک بارش شروع نہ ہوئی تھی۔ وہ ان پہاڑی راستوں پر چلنے کا عادی نہ تھا اس لیئے ذرا دیر بعد اُس کا سانس پھول گیا اور اُس نے ہانپنا شروع کر دیا۔ ذرا ہی دیر بعد اُسے

دونوں کچے مکان نظر آنے لگے۔ وہ دم لینے کو رُکا اور گھوم کر پیچھے دیکھا کہ کہیں بابا تو نہیں آرہا ہے۔ لیکن آج کوئی بھی نظر نہ آیا۔ اُس نے بڑی سڑک کو چھوڑ دیا اور ڈھلان پر سے اُتر کر کھیت کے بیچ سے گذرنے لگا۔ کیا وہ لڑکی اب تک وہیں ہوگی! لیکن ایسا معلوم تو نہیں ہوتا تھا کیونکہ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ چارلی نے سچ ہی کہا تھا۔ وہ ضرور لڑکی اور اُس کی نانی کو لے کر اپنے گھر چلا گیا ہے ان خیالات سے اُسکی تسلی ہو جانی چاہیئے تھی لیکن نہ معلوم کیوں اُس کے قدم آگے بڑھتے ہی گئے۔ اب وہ مکان کے دروازے پر پہنچ چکا تھا۔ دونوں جھونپڑیوں کے دروازے بند تھے اور دونوں ہی جگہ تالے لگے ہوئے تھے۔

اب اُس کی کھوج بین کا جذبہ ختم ہوا تو وہ واپس مُڑا۔ ابھی وہ مشکل سے سڑک پر پہنچا بھی نہ تھا کہ ایک موٹی سی بوند اُس پر گری اور پھر بارش شروع ہوگئی۔ سڑک پر کافی دُور بابا بھی بڑی تیزی سے اپنی جھونپڑی کی طرف آرہا تھا۔ ہائے اب کیا ہوگا!!!

اُس نے جھٹ اپنا چھاتہ کھول لیا اور سڑک پر پہنچ کر نیچے کی طرف چلنے لگا۔ کچھ فاصلے پر جا کے وہ ایک درخت کے نیچے ٹھہر گیا اور درخت کے تنے کے پیچھے کھڑا ہوگیا۔ جب بابا سڑک سے اُتر کر کھیت والے کچے راستے پر کافی آگے نکل گیا تو اُس نے واپس اپنے ہوٹل کی طرف چلنا شروع کیا۔ اُس کا دل چاہ رہا تھا کہ کسی طرح اُڑ کر اِس خطرناک جگہ سے دُور ہو جائے۔ چڑھائی چڑھتے اُس کا سانس پھول گیا اور اب تو بڑی مشکل سے قدم اٹھائے جاتے تھے۔ کچھ تو رات کی بے آرامی تھی اور کچھ اُسے نہ جانے کیا کیا خیالات ستا رہے تھے کہ وہ اب ایک دم جیسے ہمت ہار بیٹھا ہو۔ ایک اندرونی آواز

اُسے چارلی کی طرف سے خبردار کر رہی تھی تو دوسری طرف اُس کی ہٹ دھرمی اُسے مجبور کر رہی تھی کہ وہ گھر واپس جانے کا دل میں خیال ہی نہ لائے۔ کیا اِس طرح زندگی کے دن گذارنا درست ہے؟ ڈر اور شک رہ رہ کر اُسکے دل میں سما جاتا اور اُسے کچھ سمجھ نہ آ رہی تھی کہ وہ مدد کے لئے کس کے پاس جائے۔

اُس کے راستہ میں ایک مسجد تھی۔ "کیا نماز پڑھنے سے مجھے دلی سکون نصیب ہو سکتا ہے؟" ایک پل کے تذبذب کے بعد وہ مسجد میں داخل ہو گیا اور خدا تعالےٰ سے دعا کرتا رہا کہ اُسے کچھ سکون نصیب ہو۔ اُس نے خلوصِ دل سے نماز پڑھی۔ اُس وقت مسجد میں اور کوئی نہ تھا۔ کچھ دیر بعد جب وہ فارغ ہوا تو اُس کا دل بدستور بے چین ہی تھا۔ بار بار یہ خیال اُس کے دل میں آتا کہ وہ نافرمان اور ضدّی بچّہ ہے اِس لئے اُس کی دُعا کب منظور ہو سکے گی۔ چھاتہ کھول کر وہ باہر سڑک پر آ گیا۔ لیکن اُس کی پریشانی بڑھتی ہی چلی گئی۔ "کیا چارلی نے درست کہا تھا؟ شاید وہ سچ کہتا تھا کہ خدا ہے ہی نہیں۔ شاید لوگوں نے اپنے دل و دماغ کو دھوکا دینے کے لئے خدا کے بارے میں چند تصوّرات گھڑ رکھے ہیں۔"

اِن ہی خیالات میں کھویا ہوا اسلم بے رونق اور بارش کے پانی سے بھری ہوئی گلیوں میں سے ہو کر گذر رہا تھا۔ اب تو تھکان سے اُس کے پاؤں پھول چکے تھے اور قدم اٹھانا اور بھی مشکل ہو رہا تھا۔ گھسٹتے گھسٹاتے جب وہ ہوٹل میں پہنچا تو دوپہر ہو چکی تھی۔ اپنے دوست کی جدائی کا رنج اُسے بُری طرح محسوس ہونے لگا۔ ہوٹل کے باہر ایک بھکارن اپنے بلکتے ہوئے بچّے کو اپنے سینے سے چمٹائے بیٹھی تھی۔ بچّہ کی ناک بہہ رہی تھی۔ انہیں یوں بیٹھے دیکھ کر اسلم کا دل دھک سے رہ گیا اور نہ جانے کیوں اسے اپنی ماں کا خیال آنے لگا۔ اُس نے دو قلیوں کو بھی دیکھا جنہوں نے اپنے سروں پر بستر اور سوٹ کیس

اُٹھا رکھے تھے۔ انہوں نے تھوڑی دیر کے لئے اپنا اپنا بوجھ نیچے رکھا اور ذرا دیر سستانے کو زمین پر ہی بیٹھ گئے۔ پھر انہوں نے ایک دوسرے کی مدد سے اپنا اپنا بوجھ سر اور کاندھے پر رکھا۔ دونوں ایک دوسرے کے لئے کتنے مددگار تھے۔ اب وہ دوستوں کی طرح گپ بازی کرتے پہاڑی پر چڑھنے لگے۔ انہیں دیکھ کر اسلم کے دل میں یہ خیال آیا کہ وہ کتنے خوش قسمت ہیں کہ ایک دوسرے کا بوجھ بٹاتے ہیں۔ اس سے پہلے اُسے اپنا اکیلا پن اتنا محسوس نہ ہوا تھا جتنا اب ہو رہا تھا۔ یہاں وہ اِس وقت بالکل تنہا تھا۔ اُس کے کندھوں پر کس قدر بھاری بوجھ آپڑا تھا لیکن مدد یا تسلی کے لئے اُس کے نزدیک کوئی بھی نہ تھا۔ گہری سرد آہ لیتے ہوئے اُس نے بڑی دھیمی سی آواز میں کہا "کاش میرا بھی کوئی دوست ہوتا"

گھڑی ساڑھے پانچ بجا رہی تھی۔ اسلم اپنے بستر پر لیٹ گیا اور تکیے میں منہ دے کر دیر تک روتا رہا۔ اُس کا خیال تھا کہ شاید رونے سے اُس کے دل کا غبار نکل جائے گا اور دوسری صبح جب وہ بیدار ہوگا تو سارے تفکرات دور ہو چکے ہوں گے۔ آج وہ اندر سے دروازہ بند کرنا بالکل بھول گیا۔ وہ اتنا پریشان تھا کہ اُسے یہ خیال ہی نہ رہا کہ اپنے مصنوعی بال، ڈاڑھی اور مونچھیں الماری میں بند کر دیتا۔ ساری چیزیں پلنگ کے قریب سے آرام کرسی پر پڑی ہوئی تھیں۔ آج وہ بدنی اور ذہنی طور پر سخت تھکا ہوا تھا اِس لئے اُسے کسی بھی چیز کی ہوش نہ تھی۔ ٹین کی چھت پر بوندوں کی ٹپ ٹپ ایک ایسی موسیقی تھی جسے وہ سنتے سنتے ایک دم ہی گہری نیند سو گیا۔

نیند میں بھی ان پریشان کُن خیالات نے اُس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ اُس نے خواب میں دیکھا کہ وہ مال روڈ پر ٹہل رہا ہے۔ اچانک ایک دکان میں سے

بوڑھا بابا کود کر اُس کی طرف جھپٹا۔ اُس کے ہاتھ میں لمبا سا خنجر ہے۔ ڈر سے اسلم کے قدم جیسے زمین پر گڑ گئے ہوں۔ وہ بھاگنا چاہتا ہے لیکن اس کے قدم اٹھتے ہی نہیں ہیں۔ لمحہ بلمحہ بابا نزدیک آتا چلا جا رہا ہے۔ اسلم کے پسینے چھوٹ رہے ہیں اور دل تیزی سے دھڑک رہا ہے۔ اب بابا اپنے ہاتھ بڑھا کر اُس کی گردن دبوچنے ہی والا ہے کہ وہ پھر ایک آخری کوشش کرتا ہے۔ اب اُس کی ٹانگیں کام کرنے لگ جاتی ہیں اور وہ اپنی پوری قوت سے دوڑنے لگتا ہے۔ کچھ دیر بعد وہ پیچھے گھوم کر دیکھتا ہے کہ بابا بھی اتنی ہی تیزی سے اُس کا پیچھا کر رہا ہے اور اب بھی اگر وہ ذرا سا رُکا تو بابا کا ہاتھ اُس کی گردن دبوچ لے گا۔ اب اسلم کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی کی انگلیاں اُس کی گردن کو چھو رہی ہیں۔ اُس نے پھر ایک نئے جوش کے ساتھ دوڑنا شروع کر دیا تو بابا نے چیخ کر کہا۔ "او۔ بدذات ٹھہر۔ میں ابھی تجھے پولیس کے حوالے کرتا ہوں"۔ پولیس کا نام سنتے ہی اسلم نے اپنا پورا زور لگایا۔ وہ چاہتا تھا کہ جس طرح بھی ہو وہ اپنے ہوٹل والے کمرے میں پہنچ جائے تاکہ اندر سے دروازہ بند کر کے پولیس سے تو بچ جائے۔ اب اُسے ہوٹل نظر آ رہا تھا۔ چار چار سیڑھیاں ایک چھلانگ میں چڑھتا وہ اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔ تیزی سے اندر گھس کر اُس نے جھٹ چٹخنی چڑھائی اور ہانپتے ہوئے دروازے کے ساتھ بیٹھ لگا کر فرش پر ہی ڈھیر ہو گیا۔ ذرا دیر بعد بابا بھی دروازے پر آ پہنچا اور زور زور سے کھٹکھٹاتے ہوئے کہا "دروازہ کھولو۔ دروازہ کھولو" اسلم نے دل میں کہا "میں بالکل جواب نہیں دیتا تو یہ بیوقوف خود ہی تھک ہار کر یہاں سے دفع ہو جائے گا"۔ لیکن بابا تھا کہ جانے کا نام ہی نہ لیتا تھا بلکہ اور بھی زور زور سے دروازہ پیٹنے لگا۔

اسلم چونک کر اٹھ بیٹھا۔ واقعی کوئی دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا اور یہ خواب

نہیں بلکہ حقیقت تھی۔ پھر کسی نے دروازہ کھولا۔ اور آہستہ آہستہ یہ کہا۔
"معلوم نہیں کیا بات ہے؟ شاید پروفیسر صاحب سو رہے ہیں۔ لیکن مجھے پیغام بھی تو ضرور دینا ہے" ایک ہاتھ دیوار ٹٹولتا ہوا بجلی کے بٹن کے قریب گیا اور کھٹ سے کسی نے بٹن دبا دیا۔ بلب کی روشنی سے اسلم کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ اینڈی نے بڑے ادب سے کہا "معاف کیجئے گا حضور۔ آپ کو ٹیلیفون پر کوئی بلا رہا ہے۔ بڑا ضروری کام ہے"

اینڈی نے نظریں اٹھا کر جو دیکھا تو اُس کی آنکھیں کھُلی کی کھُلی رہ گئیں۔
"ہیں!!! یہ کیا؟" وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کبھی اسلم کو اور کبھی کرسی پر پڑی ہوئی داڑھی مونچھوں کو دیکھتا۔ "آپ تو میری طرح لڑکے ہی ہیں..... یہ ماجرا کیا ہے؟"

اسلم بھی گھبرا گیا۔ خوف اور شرم اُس کی آنکھوں سے صاف عیاں تھی۔ اُس نے اینڈی سے التجا کرتے ہوئے کہا۔ "خدا کے لئے اِس کا ذکر کسی سے نہ کرنا، مجھے ایسا کرنا پڑا ہی تھا۔ میں بالکل مجبور ہوں..... فون پر کون ہے کیا چارلی ہے؟ اُس کو جا کر بتا دو کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اِس لئے میں جلدی لیٹ گیا ہوں۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں"

"لیکن چارلی صاحب تو صرف آپ سے ہی بات کرنا چاہتے ہیں" اینڈی کی نظریں مصنوعی بالوں پر جمی ہوئی تھیں۔

"اُسے کہہ دو کہ میں لیٹ چکا ہوں اور اِس وقت آ نہیں سکتا۔ بھلا میں اتنی جلدی یہ مصیبتیں کس طرح پہن سکتا ہوں؟"

اینڈی نے سر ہلایا۔ اُسے اِس بدقسمت تنہا لڑکے پر بڑا افسوس ہو رہا تھا کہ نہ معلوم اُس نے کیا قصور کیا ہے جس کی یوں سزا بھگت رہا ہے۔ وہ دل

سے چاہتا تھا کہ اس لڑکے کی کسی نہ کسی طرح مدد کرے۔

جب وہ باہر جانے کو مڑا تو اسلم نے اُسے آواز دے کر کہا۔

"اینڈی کیا یہ تمہارے لئے ممکن ہے کہ کام ختم کر کے میرے پاس آؤ؟ میں اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا ہوں ورنہ میں تو پاگل ہو جاؤں گا۔"

"ضرور ضرور" اینڈی نے بغیر کچھ سوچے سمجھے کہا "فون پر آپ کا پیغام دے کر میں سیدھا یہاں ہی آجاؤں گا۔ میری ڈیوٹی ختم ہو چکی ہے۔"

اسلم نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ نو بج چکے تھے۔ "کیا چارلی نے اس لئے فون کیا تھا کہ وہ اس بات کی تسلی کرے کہ میں یہاں ہوٹل میں ہی ہوں؟ کیا میں اینڈی کو ساری بات بتا دوں یا صرف اپنے متعلق ہی بتاؤں؟ میں نے تو چارلی سے وعدہ کر رکھا ہے کہ اُس کے اس خفیہ کام کا ذکر کسی سے نہیں کروں گا اور اگر میں نے اینڈی سے اُس کے بارے میں کچھ کہا تو کیا میں اپنے محسن سے غداری نہیں کروں گا؟" یہ سوچتے سوچتے اسلم اپنے ہونٹ چباتا رہا۔

"نہیں۔ اینڈی ضرور میرا اچھا دوست ثابت ہوگا۔ پہلی دفعہ جب میں نے اُسے دیکھا تھا اُسی وقت سے میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ لڑکا قابلِ اعتماد ہے۔ شاید ہم دونوں کچھ سوچ سکیں گے کہ اس معمّہ کا حل کیا ہو سکتا ہے۔"

دروازہ پر دستک کی آواز آئی اور کسی نے بڑے ادب سے کہا "اجازت ہے؟"

"آجاؤ اینڈی۔" جب وہ اندر آگیا تو اسلم نے اُس سے کہا "چٹخنی چڑھا دو کیونکہ جاسوس ہر وقت میری تاک میں لگے رہتے ہیں۔"

'جاسوس' کے نام سے اینڈی اور چونکا۔ اور اسلم کے نزدیک آکر کہا۔

"اب بتائیں کہ بات کیا ہے۔ آپ میرے ہی ہم عمر ہیں لیکن یہ بزرگ بننے

کا چکّر کیا ہے ؟"

اسکم نے اپنا سر جھٹکتے ہوئے کہا۔" مَیں کبھی سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ یوں بھی ہو سکتا ہے۔ ایسی حیرت انگیز باتیں یا تو صرف کہانیاں ہوتی ہیں یا من گھڑت قصّے۔ اور جب مَیں اخبار میں پڑھا کرتا تھا کہ فلاں فلاں بچّہ لاپتہ ہو گیا ہے تو میں اُن خبروں کو بالکل فضول خیال کیا کرتا تھا۔"

اینڈی اس وقت مصنوعی ڈاڑھی کو اٹھا کر دیکھ رہا تھا۔" تو آپ بھی اپنے گھر سے لاپتہ معلوم دیتے ہیں ؟ معلوم ہوتا ہے کہ آپ ضرور کسی مصیبت میں گرفتار ہیں۔ اس لئے اچھا ہے کہ مجھے اپنی ساری کہانی بتا دیں۔ میں آپ کو مجبور نہیں کرتا لیکن اچھا ہی ہے کہ مجھے ساری بات بتا دیں۔ ایک اور ایک گیارہ ہوتے ہیں شاید ہم دونوں کوئی بہتر تجویز سوچنے میں کامیاب ہو جائیں۔ آپ مجھے ہمیشہ اپنا ہمدرد اور بہترین دوست پائیں گے۔"

اسکم سمجھ چکا تھا کہ اینڈی جو کچھ کہہ رہا ہے وہ خلوصِ دل سے کہہ رہا ہے اس لئے اُس نے شروع سے لے کر آخر تک ایک ایک بات اُسے بتا دی اور صاف صاف کہہ دیا کہ پڑھائی میں وہ کس قدر نکما اور سُست تھا اور اس وجہ سے نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے۔

اینڈی بڑے غور سے اسکم کی کہانی سنتا رہا۔ اُس کی آنکھوں میں حقیقی ہمدردی چھلک رہی تھی۔ کبھی کبھی وہ کوئی سوال پوچھ لیتا لیکن زیادہ وہ خاموشی سے اسکم کی کہانی سنتا رہا۔ اُس نے ایک دفعہ بھی اسکم کو یہ نہ کہا۔" تم کتنے بیوقوف تھے۔"

جب اسکم اپنی کہانی ختم کر چکا تو بڑی پُر اُمید نظروں سے اینڈی کی طرف دیکھ کر اُس نے کہا۔" دوست اب بتاؤ مَیں کیا کروں ؟ تمہارا کیا خیال ہے ؟"

اینڈی کو ساری سرگذشت سُنا کر اب اُسے بڑی تسلّی تھی کہ کم از کم اب کوئی تو اُس کا غم بانٹنے والا ہے۔

اینڈی نے ڈاڑھی نیچے رکھتے ہوئے کہا "دوست تمہارا یہ مسٹر چارلی بڑا خطرناک آدمی معلوم ہوتا ہے۔ کیا تم نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ اگر وہ حکومت کے خفیہ محکمے میں کام کرتا ہے تو وہ تمہیں کبھی بھی اپنے ساتھ یہاں نہ لاتا، بلکہ وہ تو تمہیں سیدھے کسی پولیس چوکی میں لے جاتا تاکہ تمہیں واپس گھر بھجوا دے"

کچھ دیر خاموشی میں سوچنے کے بعد اسلم بولا۔

"اینڈی تم ٹھیک کہتے ہو۔ میرے تو وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی۔ میں تو یہی سوچتا تھا کہ مجھے چھپنے کی جگہ اور نوکری چاہیئے۔ بس اس سے زیادہ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا"

"چارلی نے تمہیں اتنے اونچے ہوٹل میں ٹھہرایا ہے۔ معلوم ہے کیوں؟ اس لئے کہ وہ تم سے کوئی بڑا کام کروانا چاہتا ہے۔ ورنہ وہ تم پر اتنی رقم کیوں ضائع کرتا"

اب اسلم سمجھ گیا کہ جو کچھ اینڈی کہہ رہا ہے وہ بالکل درست ہے "کیا اب بچ نکلنے کا کوئی راستہ ہے؟ جیسا اینڈی سوچتا ہے کہ چارلی ایک خطرناک انسان ہے تو پھر وہ اپنے شکار کو کس طرح آسانی سے جانے دے گا! شاید اِس وقت بھی چارلی کے آدمی میری تاک میں لگے ہوئے ہوں کہ میں کہیں بھاگ نہ جاؤں" یہ سوچ کر اسلم کا دل بیٹھ گیا۔

انہیں کمرے کے باہر کسی کے چلنے کی آواز آئی، پھر کوئی کھانسا اور اُسی وقت کسی نے اسلم کے دروازہ پر دستک دی۔

اینڈی جھٹ اسلم کے پلنگ کے نیچے گھس گیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس وقت وہ اسلم کے کمرے میں پکڑا جائے۔ اگر واقعی چارلی کے جاسوس اسلم پر پہرہ دے رہے ہیں تو وہ ایک دم سمجھ جائیں گے کہ اینڈی اسلم کے ساتھ مل گیا ہے۔

خوف سے اسلم کے بھی پسینے چھوٹ گئے لیکن وہ خاموش لیٹا رہا۔ پھر اُس نے زور سے اپنے بستر میں کروٹ بدلی اور اونچی سی جمائی لی۔ پھر ایسی آواز میں جیسے کوئی گہری نیند سے بیدار ہوا ہو دریافت کیا "کون ہے؟ کیا بات ہے؟"

"معاف کیجئے۔ میں نے غلط دروازہ کھٹکھٹا دیا تھا"، یہ کہتے ہوئے پھر قدموں کی آواز آئی اور کوئی دور چلا گیا۔

دونوں لڑکوں کی جان میں جان آئی۔ اب اُن کو بات کرنے کی بالکل جرأت نہ رہی تھی۔ آخرکار جب انہیں پوری پوری تسلی ہوگئی کہ اب باہر کوئی نہیں ہے تو اینڈی پلنگ کے نیچے سے باہر آیا۔ کپڑے جھاڑ کر اسلم کے کان میں بولا "معلوم نہیں کون تھا؟ اب تو ہمیں حد سے زیادہ چوکنا رہنا پڑے گا۔ اس میں کوئی شک نہیں رہا کہ چارلی کے آدمی ہر وقت تمہاری ٹوہ میں لگے رہتے ہیں"۔

اسلم نے بھی سرگوشی کے لہجے میں کہا "اب میں کیا کروں؟ مجھے کچھ نہ کچھ تو جلدی کرنا ہی ہوگا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اچانک ہی چارلی یہاں آجائے اور مجھے ساتھ لے جائے"۔

"اگر میری مانو تو ایک دم واپس گھر چلے جاؤ"، اینڈی نے اسلم کو تسلی دیتے ہوئے کہا "پہلے پہل تو یہ بڑا مشکل معلوم ہوگا کہ تم اپنے والدین کے سامنے جاسکو جنہیں تم نے اتنا پریشان کیا ہے اور پھر شاید تمہارے دوست بھی تمہارا مذاق اڑائیں اور دوسرے رشتہ دار تم سے نفرت کریں۔ لیکن میرے بھائی ایک دفعہ تو یہ سب باتیں تمہیں برداشت کرنی ہی ہوں گی۔ بعد میں سب ٹھیک

ہو جائے گا۔"

اسکم نے گہری سانس لی اور سر ہلا کر بولا۔

"یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ میں بھلا ثریا کے سامنے کس طرح جا سکتا ہوں؟ جو ہمیشہ اتنے اچھے نمبر حاصل کر کے مجھے چڑاتی ہے۔ وہ تو مجھے اپنی ایکٹرس سے پاگل بنا دے گی۔"

"کیا تم نے کبھی یہ سوچا ہے کہ اپنی اس حرکت سے تم اپنے والدین کے لئے کس قدر دکھ کا باعث بن رہے ہو؟ شاید تمہاری ماں تمہارے لئے سارا دن روتی رہتی ہوں اور ضرور ہے کہ تمہارے والد صاحب بھی تمہاری جدائی کے غم میں نڈھال ہوں۔" اینڈی نے اسکم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اس کا بڑا اچھا نتیجہ نکلا کیونکہ اسکم نے سر ہلا کر کہا "درست ہے اینڈی۔ ان دنوں میں نے بڑی شدت سے یہ محسوس کیا ہے کہ میرے والدین کی جگہ دنیا کا کوئی بھی شخص نہیں لے سکتا۔ لیکن پھر بھی....."

"تو تمہارا مطلب یہ ہے کہ اب تم بھی اس بات کو ماننے لگ گئے ہو؟ لیکن ڈرتے صرف اس بات سے ہو کہ اگر تم واپس گھر چلے گئے تو وہ تمام پرانی باتیں پھر شروع ہو جائیں گی؟"

اسکم نے بڑی حیرانی سے پوچھا "اینڈی تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا۔ کیا تمہارے سامنے بھی اس قسم کے مسئلے ہیں؟ میں نے بہت دفعہ یوں محسوس کیا ہے کہ مجھ میں دو قسم کی فطرتیں بسی ہوئی ہیں۔ ایک تو مجھے اچھا لڑکا بننے کے لئے کہتی ہے لیکن دوسری یہ کہتی ہے کہ گھر واپس نہ جاؤں بلکہ اپنے والدین کو ہی سب باتوں کا ذمہ دار ٹھہراؤ۔"

اینڈی ہنس دیا۔ "یہی تو رونا ہے۔ اس زمانے کا ہر نوجوان اس تجربہ

سے دوچار ہوتا ہے۔ لیکن میں تو یہ جانتا ہوں کہ ایسا سوچنے میں ہم کس قدر خودغرضی کا شکار ہو جاتے ہیں۔"

"تو پھر ایسے موقع پر تم کیا کرتے ہو؟" اسکم نے اپنے سوال میں بڑی بے تابی دکھائی۔

"دراصل بات یہ ہے کہ جب سے میں مسیحی ہو گیا ہوں۔ میں اکیلا نہیں ہوں۔ کیونکہ مسیح یسوع جنہیں آپ لوگ حضرت عیسیٰ کہتے ہیں میری بُری فطرت پر قابو پانے میں میری مدد کرتے ہیں۔"

"عیسائی بن جانے سے پہلے تم کیا تھے؟"

اینڈی نے اسکم کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "میں صرف نام کا ہی مسیحی تھا۔ صرف اس لئے کہ میں ایک مسیحی گھر میں پیدا ہوا تھا۔ لیکن ہماری بائبل مقدس یہ بتاتی ہے کہ ہم محض اپنی پیدائش کی بنا پر مسیحی نہیں بن سکتے۔ ہر ایک کو خود یہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ وہ سچے دل سے مسیح کی پیروی کرنا چاہتا ہے یا نہیں۔ والدین اپنے بچوں کے لئے کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے ہیں۔"

اسکم نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "میں نے تو کبھی اس طرف دھیان ہی نہیں دیا۔"

اب اینڈی اسکم کے پلنگ پر بیٹھ گیا اور اُس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "جو شخص کسی مسیحی خاندان میں پیدا ہونے کی وجہ سے مسیحی ہے اُس کی مثال اُس لڑکے کی مانند ہے جسے زبردستی کسی سکول میں داخل کرا دیا جاتا ہے۔ والدین اُس کی فیس ادا کر دیتے ہیں، رجسٹر میں اُس کا نام لکھ لیا جاتا ہے لیکن اُسے سکول سے کوئی دلچسپی نہیں اور نہ ہی وہ جانا چاہتا ہے۔ اگر وہ کبھی جائے بھی تو اُسے سکول کے قوانین کی پرواہ نہیں ہوتی، نہ ہی وہ ایک لفظ پڑھتا ہے۔

اُس کے بُرے برتاؤ سے اُس کے استاد اُس سے تنگ آجاتے ہیں اور تنگ آکر سکول سے اُس کا نام کاٹ دیتے ہیں۔ اب اُس شخص کے لئے جو خداوند مسیح یعنی حضرت عیسیٰ مسیح کو سچّے دل سے ماننا چاہتا ہے اُس کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ ذاتی طور پر انہیں دل سے قبول کرے اور اُن کے بتائے ہوئے راستہ پر چلے۔ جس دن ہم ایسا کرنے کا فیصلہ کر لیتے ہیں تو اُسی دن ہمیں یہ یقین ہو جاتا ہے کہ اب مسیح ہمیشہ ہمارے ساتھ رہیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ گذرے چند سال میں نے بڑی اچھی طرح گذارے ہیں۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ مَیں اکیلا نہیں ہوں۔ بلکہ میرے آقا برابر میرے ساتھ ہیں۔"

جس جوش میں اینڈی اپنے اس تجربہ کو بیان کر رہا تھا اُس سے یہ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ واقعی وہ جو کچھ بھی کہہ رہا ہے اُس کا اُسے ذاتی تجربہ ہے۔

اسلم گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ جس پیرایہ میں اینڈی نے گفتگو کی تھی اُس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اپنے ایمان میں کتنا مضبوط ہے۔ اُسکی بات چیت میں مذہبی تعصّب نہ تھا۔ اِسی لئے اب اُس کے دل میں اینڈی کے لئے ایک خاص عزّت پیدا ہو گئی تھی۔ پہلی مرتبہ جب اینڈی نے اپنا نام بتایا تھا اور اُسے یہ معلوم ہوا، کہ وہ مسیحی ہے تو اسلم کے دل میں نفرت کا ہلکا سا جذبہ اُبھرا تھا۔ لیکن اب وہ یہ سوچ رہا تھا کہ کیا مذہب کے نام پر کسی سے نفرت کرنا یا اُسے دوست بنانا یا نہ بنانا جائز ہے یا بالکل غلط۔ کیا یہ ضروری نہیں کہ ایک شخص میں اعلےٰ خاصیتیں اور اچھے اطوار و عادات دیکھ کر اُس کو پسند کیا جائے اور اُس سے تعلقات بڑھائے جائیں؟ مسلمانوں میں بھی اچھے اور بُرے دونوں قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ بالکل یہی حال مسیحیوں کا بھی ہے۔

اب سب چارلی کا خیال اُس کے ذہن میں آیا تو وہ کانپ گیا۔ کیا اس جال سے نکل بھاگنے کی کوئی صورت ہے؟ ڈر اور مایوسی پھر اسلم کی آنکھوں میں نظر آنے لگی۔

اینڈی ایک دم اسلم کو دیکھ کر سمجھ گیا کہ وہ کتنا مایوس ہے۔ اُسے بچارے پر بڑا ترس آرہا تھا اور وہ دل سے چاہتا تھا کہ کسی نہ کسی طرح اس لڑکے کی مدد کرے۔

"اینڈی" اسلم نے قدرے رُکتے رُکتے کہا۔ "اگر میں واپس گھر چلا جاؤں تو تمہارا کیا خیال ہے؟"

اینڈی کی زبان سے بے اختیار یہ الفاظ نکلے "اس سے بہتر اور کیا فیصلہ ہو سکتا ہے؟" اینڈی کو کبھی امید بھی نہ تھی کہ اسلم اتنی جلدی اور اتنی آسانی سے مان جائے گا۔

"لیکن اگر میں واپس گھر چلا بھی تو چارلی کا خوف تو مجھے ہر وقت رہے گا۔"

اسلم کی آواز میں بے حد مایوسی تھی اور اب تو اینڈی بھی سمجھ سکتا تھا کہ چارلی کتنا خطرناک آدمی ہے۔ وہ کسی بھی وقت اپنے آدمی بھیج کر اسلم کو اُس کے گھر سے اٹھوا سکتا ہے۔ دوسرا اسلم ہر وقت گھر کی چار دیواری میں بھی قید نہیں رہ سکتا ہے۔

"اینڈی میں تو ہر طرف سے مصیبت میں گھرا ہوا ہوں۔" اسلم کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

اینڈی بھی سوچ رہا تھا کہ اس مصیبت کا آخر کیا حل ہو سکتا ہے؟ انہیں چاہیئے کہ وہ کسی نہ کسی طرح چارلی کے تمام کاروبار کا پتہ لگائیں اور پھر پولیس والوں کو اُس کی رپورٹ دے دیں۔

"اسکم تمہارے پاس چارلی کا دیا ہوا پتہ تو ہے۔ ہم پولیس کو اُس کی جگہ نہ بتا دیں؟"

لیکن اسکم نے سر ہلا کر کہا "یہ نہیں ہو سکتا۔ اگر ہم پولیس میں اُس کی رپورٹ درج کروائیں تو پہلے تو پولیس ہم چھوکروں کی بات مانے گی ہی نہیں۔ ہمیں رپورٹ درج کروانے سے پہلے کوئی ثبوت بھی تو مہیا کرنا چاہیئے۔"

اب اینڈی بھی سوچ رہا تھا کہ واقعی یہ بات کتنی خطرناک ہے۔ اگر وہ چارلی کے بتائے ہوئے پتہ پر اُس کے بنگلے بیت القمر جانے کی بابت سوچیں تو یہ بھی بڑا جان جوکھوں کا کام ہے۔ کیونکہ چارلی نے اُن دونوں کو دیکھا ہوا ہے اور وہ اُن دونوں سے واقف ہے۔ وہ انہیں ایک دم پہچان لے گا۔

آخر سوچتے سوچتے اُن کے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ پہلے پہل تو یہ انہیں نری بیوقوفی نظر آتی تھی۔ لیکن صرف اِس سے اُن کی تمام مشکلات حل ہو سکتی تھیں۔ اُس میں ہر طرح سے خطرات تھے۔ لیکن اس جال میں سے نکلنے کی اِس کے علاوہ اَور کوئی صورت بھی نہ تھی۔ اگر وہ اپنی باقی عمر چارلی کے خوف سے آزاد ہو کر گذارنا چاہتے تھے تو انہیں یہ خطرہ تو مول لینا ہی ہوگا۔ پھر وہ دیر تک اُس ترکیب کے بارے میں سوچتے رہے۔

جب اینڈی اسکم کے کمرے سے باہر جانے لگا تو اسکم نے زور سے اُس کا ہاتھ دبایا اور خلوص دل سے کہا۔

"اینڈی۔ تمہارا شکر گذار ہوں۔ تم واقعی میرے سچے دوست ہو۔" اسکم کے یہ آخری الفاظ دیر تک اینڈی کے ذہن میں گونجتے رہے۔ اُس کا دل خوشی سے بھرپور تھا۔ کیا کسی کا سچا دوست بننے سے دنیا میں اور کوئی چیز بہتر ہو سکتی ہے؟

باب ۶

آج اتوار کا دن تھا۔ اسلم رات بھر گہری نیند سویا رہا تھا۔ اُس نے پکّا ارادہ کر لیا تھا کہ وہ اپنے گھر واپس چلا جائے گا اِس لئے ایک بہت بھاری بوجھ اُس کے ذہن سے اُتر گیا تھا۔ کافی دن چڑھے وہ بیدار ہوا۔ کمرے میں سورج کی روشنی ہر سُو پھیلی ہوئی تھی۔ اُس نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھا اور نیند کے خمار میں بڑبڑایا "ارے واہ۔ گیارہ بج رہے ہیں"۔ کمرے کے باہر لوگوں کے چلنے پھرنے کی آواز آ رہی تھی۔ موسم صاف تھا اس لئے سیر و تفریح کے لئے آئے ہوئے لوگوں کا باہر ہجوم تھا۔ رات والے پروگرام کے بارے میں سوچتے ہوئے اسلم مسکرا کر کہنے لگا۔ "اس ہجوم کی ہی وجہ سے جب ہم یہاں سے فرار ہوں گے تو ہماری طرف کسی کا بھی دھیان نہ ہو سکے گا"۔

کسی نے رُک رُک کر تین بار دروازہ کھٹکھٹایا۔ اینڈی نے اپنی شناخت کے لئے اسلم کو رات ہی کو یہ نشان دیا تھا۔ اُس نے جھٹ دروازہ کھول دیا۔ اینڈی جلدی سے اندر داخل ہو گیا۔ اُس نے ایک بڑی سی ٹوکری اُٹھائی ہوئی تھی۔ اسلم نے جلدی سے دروازہ بند کرتے ہوئے پوچھا

"سب ٹھیک ہے نا؟"

اینڈی نے ٹوکری نیچے رکھتے ہوئے کہا۔ "سب ٹھیک ہے۔ مجھے حکم ہوا تھا کہ میں گندے کپڑے دھوبی کو دے آؤں۔ جب میں اس ٹوکری میں گندے کپڑے ڈال رہا تھا تو دو ایک بیروں نے میرا مذاق بھی اڑایا لیکن میں خاموشی سے اپنا کام کرتا رہا۔ دھوبی کو کپڑے دینے کے بعد میں نے بازار سے چند چیزیں خریدیں، اس ٹوکری میں ڈالیں اور اب سیدھا یہاں ہی آ رہا ہوں۔"

اسکم نے ٹوکری کھولی تو نفرت سے اپنی ناک سکیڑی۔ گندے گندے لڑکیوں والے کپڑے بھرے پڑے تھے۔ سُرخ رنگ کی قمیض، گلابی رنگ کی شلوار جس کا رنگ اُڑ چکا تھا اور ایک دوپٹہ جو شاید کبھی سفید ہوگا لیکن اب میل سے پیلا سا نظر آ رہا تھا۔ لمبی سانس لیتے ہوئے اسکم نے کہا "او خدا!!! تمہیں یہ چیزیں کہاں سے ملیں؟.... اور کیا میں انہیں پہنوں گا؟"

"تو اور کیا۔ انہیں پہن کر تو تم حُور نظر آؤ گے۔ تمہیں معلوم ہے ان کی قیمت؟ میں نے ان کے بدلے ایک نیا جوڑا موچی کی عورت کو دیا ہے۔"

"پُف" اسکم نے اِدھر اُدھر سر کو ہلاتے ہوئے کہا۔

"مجھے ان کے پہننے کا شوق تو بالکل نہیں ہے، لیکن میں تمہاری سوجھ بوجھ کی داد ضرور دیتا ہوں۔ ایک غریب لڑکی کے لئے پرانے کپڑے ہی ٹھیک ہوں گے۔" ٹوکری کے نیچے بالیوں کی ایک جوڑی، چھ آٹھ کانچ کی چوڑیاں اور ایک پرانا پراندہ بھی پڑا ہوا تھا۔ اسکم نے باری باری سب کو دیکھا اور موٹی موٹی آنکھیں نکال کر اینڈی کی طرف دیکھ کر کہا۔

"تو یہ سب بھی مجھے پہننا ہوگا؟"

"جی میری بلّو جی۔"

جب اینڈی نے اسلم کے کانوں میں بندے ڈالے تو دونوں کے ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ گئے۔

پھر اینڈی نے اسلم کے لمبے لمبے بالوں میں بیچ کی مانگ نکالی اور بڑی ہوشیاری سے پراندہ اُن میں لگا دیا۔ اور پھر اسلم کو شیشہ دکھاتے ہوئے بولا۔ "اب ہم اپنی بلّو کا نام کیا رکھیں؟ میرا خیال ہے اب سے تم حنیفہ ہو گی۔"

"میں ....."

لیکن اینڈی نے ہونٹوں پر اُنگلی رکھتے ہوئے اُسے خاموش ہو جانے کو کہا۔ "اتنے جوش میں نہ آؤ۔ کہیں باہر کوئی سنتا ہی نہ ہو کہ اندر کیا ہو رہا ہے۔"

پھر اُس نے ایک پرانی سی قمیض، شلوار اور پھٹی ہوئی سویٹر نکالی جو اُس نے اپنے لئے خریدی تھیں۔ کاغذ کی تھیلی میں ایک ٹوٹی ہوئی پشاوری چپل تھی جو بہت زیادہ استعمال شدہ نظر آتی تھی۔ اُس نے سب چیزیں فرش پر پھیلا دیں اور اسلم کی مصنوعی بالوں والی ٹوپی ڈاڑھی اور مونچھیں اٹھاتے ہوئے کہا۔ "مہندی لگا کر میں انہیں سُرخ کر لیتا ہوں پھر یہ بڑی شاندار نظر آئیں گی۔"

اسلم کچھ سوچ کر خوف سے کانپ گیا۔ "اینڈی اگر ابھی چارلی آ جائے تو پھر کیا ہو گا؟ میری سفید ڈاڑھی مونچھیں تو سُرخ ہو چکی ہوں گی۔"

"دوست ہمیں اب یہ خطرہ تو مول لینا ہی ہو گا۔ خیر خدا پر بھروسہ رکھو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"

انہوں نے سارے کپڑے الماری میں بند کر دیئے۔ اور دل میں بھی ڈر تھا کہ اگر اِس وقت چارلی آ دھمکا تو وہ ہم دونوں کو ختم کر دے گا۔

اچانک اسکم بڑا سنجیدہ نظر آنے لگا۔ اُس نے اینڈی کو کرسی پر بیٹھنے کے لئے کہا اور اُس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"تم اتنے وثوق سے کیونکر کہہ سکتے ہو کہ خُدا ہے؟ چارلی کو تو اس بات کا یقین تھا کہ یہ سب فضول خیالات ہیں اور خدا ہے ہی نہیں۔"

"ہے کیوں نہیں" اینڈی نے کرسی آگے کھینچتے ہوئے کہا۔ "تو کیا اس وجہ سے تم اتنے پریشان ہو؟ جب تک انسان اپنی پوری بے بسی محسوس نہ کرے تو خُدا اپنے آپ کو اُس پر ظاہر نہیں کرتا۔ جب تک انسان الٰہی برکات کے لئے بھوکا نہ ہو اُسے خُدا کی پہچان کی اُمید نہیں ہو سکتی۔ ہمارے کلام پاک میں یوں لکھا ہوا ہے "تم مجھے ڈھونڈو گے اور پاؤ گے، جب پورے دل سے میرے طالب ہو گے"۔ خُدا تعالےٰ بار بار اس بات میں ہماری حوصلہ افزائی کرتا ہے کہ "ہم آزما کر دیکھیں کہ وہ اپنے وعدوں کو پورا کرتا ہے یا نہیں"۔

"اسکم ہمارا خُدا کوئی پتھر کا بُت نہیں ہے کہ اپنے وعدے کو پورا نہ کر سکے۔ وہ تو زندہ خدا ہے۔ وہ اپنے روح کو اس پر ایمان رکھنے والوں کے دل میں بساتا ہے"۔

"اینڈی تمہیں یہ کس طرح معلوم ہے کہ خدا کا روح تم میں بسا ہوا ہے؟ کہیں یہ تمہارا وہم ہی تو نہیں کہ ایسا ہے؟"

"نہیں نہیں۔ وہ تو ایک اچھے اور مہربان استاد کی طرح ہر وقت میرے ساتھ ساتھ رہتا ہے۔ جب بھی کوئی غلط کام کروں تو وہ ایک دم مجھے یہ بتا دیتا ہے کہ میں نے غلط کام کیا ہے اور کہ مجھے معافی مانگنی چاہیئے۔ وہی مجھے دعا مانگنے کے لئے اُبھارتا ہے۔ جب میں غمزدہ اور مایوس ہوں تو وہ تسلی دیتا ہے۔ وہ مجھے یقین دلاتا رہتا ہے کہ وہ ہمیشہ میرے ساتھ ساتھ

ہے۔ وہ مجھے اُبھارتا ہے کہ کلام کا مطالعہ کروں اور جتنی دفعہ بھی زیادہ ممکن ہو دعا کرتا رہوں۔ کیونکہ ہم جتنا پاک کلام کا زیادہ مطالعہ کریں اتنا ہی زیادہ وہ ہم سے ہمکلام ہوگا اور ہم پر یہ ظاہر کرتا رہے گا کہ ہمیں کس قسم کی زندگی گذارنی چاہیئے۔"

"تو تمہیں یقین ہے کہ تمہیں ان سب باتوں کا روزانہ تجربہ ہوتا رہتا ہے؟" اسکم نے گہری نظروں سے اینڈی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "یہ بات تو میں بھی سمجھ گیا ہوں کہ وقت گذارنے کے لئے ہی باتیں نہیں کرتے۔ تمہیں اِس بات سے کتنی تسلی ملتی ہوگی کہ تمہاری مدد کرنے کے لئے کوئی ہر وقت تمہارے ساتھ ہوتا ہے۔"

کچھ دیر بعد اینڈی چلا گیا اور ہوٹل میں اپنے کام کاج میں مشغول ہو گیا لیکن اسکم کرسی پر بیٹھا جو کچھ اینڈی نے کہا تھا اُس پر سوچتا رہا۔

اگلی صبح دونوں نے اپنے اپنے کپڑے پہنے۔ اسکم نے ایک غریب سی لڑکی کا بھیس بدلا۔ میلے کچیلے کپڑے پہن لئے۔ اینڈی ایک گرم چادر بھی لے آیا تھا تاکہ وہ اُس سے اپنے سر اور کندھوں کو ڈھانک لے اور اگر ضرورت پڑے تو بڑا سا گھونگھٹ بھی نکال لے۔ اینڈی نے بوڑھے بابا والے کپڑے پہنے۔ سُرخ رنگ کی ڈاڑھی مونچھ اور بال بڑے اچھے لگ رہے تھے۔ سُرخ بالوں پر اُس نے گندی سی پگڑی باندھ لی۔ اب اُس نے اسکم کا بڑا چھاتہ پکڑ لیا۔ ذرا جُھک کر چلنے لگا اور کبھی کبھی بوڑھوں جیسی کھانسی بھی کھانستا۔

"آؤ میری بیٹی اب ہم چلیں۔" اُس کی آواز بڑی گہری تھی اور ساتھ

ہی وہ کھانسا بھی۔

یہ سب دیکھ کر اسلم کی زور سے ہنسی نکل گئی۔ لیکن بابا نے جھٹ اُسے ڈانٹا "حنیفہ۔ مردوں کی طرح اِس طرح زور سے نہ ہنسو۔ کیوں بیڑا غرق کرنے لگی ہو؟" حنیفہ نے بڑی باریک سی زنانہ آواز میں کہا "بابا جی معاف کردو۔ آئندہ کبھی نہیں ہنسوں گی۔"

اینڈی نے رات ہی کو ہوٹل کے منیجر سے کہہ دیا تھا۔ کہ پروفیسر احسن صاحب کا پروگرام بدل گیا ہے اور اب وہ جلدی واپس جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ساتھ ہی اپنے لئے بھی بتا دیا تھا کہ وہ بھی اپنے گاؤں واپس جا رہا ہے۔ اب یہ دونوں بالکل تیار تھے اور سرحد کی طرف اپنا سفر شروع کرنے والے تھے۔ پہلے تو سانس باندھ کر وہ باہر کی حرکات و سکنات کا جائزہ لیتے رہے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ جب وہ کمرے سے باہر نکلیں تو کوئی انہیں دیکھ لے۔ کیونکہ اِس وقت وہ بالکل فقیر فقیرنی لگ رہے تھے۔ دونوں کے ہاتھ میں خالی کٹورے تھے کہ اگر کسی نے اُنہیں دیکھ کر روکا تو وہ اپنے کٹورے آگے کر دیں گے اور اُس سے بھیک مانگیں گے۔

دبے پاؤں وہ باہر نکلے۔ راہداری میں کوئی بھی نہ تھا۔ بابا کمر جھکائے آگے آگے بڑھ رہا تھا۔ پیچھے پیچھے وہ لڑکی قدم سے قدم ملاتے چلی آ رہی تھی۔ انہیں اِس چیز کا احساس تھا کہ چارلی کے چھوڑے ہوئے جاسوس ضرور ہر آنے جانے والے پر نگاہ رکھتے ہوں گے۔ اِس لئے وہ بالکل فقیروں والی چال ڈھال بنا کر چلنا چاہتے تھے۔ اب وہ برآمدے سے گذر کر سیڑھیوں سے نیچے اُتر رہے تھے۔ دروازے پر چوکیدار نے بڑی حیرانی سے اُن کی طرف دیکھا۔

"اوئے بڈھے۔ تم اِس طرف کدھر جاتا ہے؟ اوپر کیا کرتا تھا خبیث؟"

چوکیدار نے بوڑھے کا ہاتھ زور سے جھنجھوڑا۔

بوڑھے نے بڑی مریل سی آواز میں کہا۔ "فقیر ہیں خان صاحب۔ ایک پیسہ مل جائے خان صاحب"

فقیرنی نے بھی پھٹی ہوئی آواز میں کہا "خدا کے نام میں ایک پیسہ۔ میرا بابا بڑا بیمار ہے اور ہمارے پاس دوائی کے لئے پیسے نہیں ہیں۔ خدا کے لئے کچھ دے دو صاحب جی"

اب ایک بیرا بھی اُدھر آنکلا۔ انہیں دیکھ کر بڑی حقارت سے بولا۔ "چلو چلو دفع ہو جاؤ یہاں سے" جیب میں سے ایک پیسہ نکال کر بوڑھے کے کٹورے میں زور سے پھینکا۔

"اللہ تجھے پُتر دے بٹیا"

"نہ بابا نہ، پہلے ہی چھ ہیں۔ ایسی دُعا نہ مانگ"

چوکیدار دل میں حیران ہو رہا تھا کہ وہ تو ایک منٹ کو دروازے سے نہیں ہٹا۔ پھر یہ دونوں اوپر کیسے پہنچ گئے؟ کہیں انہوں نے اُوپر چوری تو نہیں کی؟

یہ دونوں ہوٹل سے باہر نکل آئے۔ لڑکی ذرا سی ہنسی لیکن ایک دم خاموش ہو گئی۔ باہر جھاڑی کے پیچھے ایک شخص کھڑا تھا۔ وہ جھٹ آگے بڑھا اور دونوں کو گھور گھور کر دیکھنے لگا تو بابا نے جھٹ اپنا کٹورا آگے بڑھا دیا۔

"سرکار۔ خدا کے نام میں ایک پیسہ مل جائے"

اُس آدمی نے زمین پر تھوکتے ہوئے کہا۔ "معاف کرو جی، معاف کرو" اور دوسری طرف نکل گیا۔

اب یہ دونوں سڑک پر پہنچ چکے تھے۔ بابا نے آہستہ سے لڑکی کے کان میں کہا "تم نے اُس آدمی کو دیکھا تھا؟ وہ یقیناً چارلی کا جاسوس تھا۔"
وہ آگے بڑھتے رہے اور اس بات سے خوش تھے کہ اُنہیں کوئی پہچان نہیں سکا تھا۔ انہوں نے واقعی بڑے اچھے طریقہ سے اپنا بھیس بدلا ہوا تھا۔
"بابا سانس دُرست کرنے کو رُکا اور کہنے لگا۔" پنڈی پہنچ کر ہم پہلے گھر جائیں گے۔ میرے ہاتھ میں حُقّہ ہونا بہت ضروری ہے۔ نہ معلوم میں کس طرح اتنی ضروری چیز لانا بھول گیا۔"
اب وہ بس سٹاپ پر آ پہنچے۔ پنڈی جانے والی بس بالکل تیار تھی۔ دو ایک مسافروں کی کمی تھی۔ ڈرائیور نے انجن چلا دیا تھا۔
"پنڈی بھئی پنڈی۔ بابا پنڈی جانا ہے۔ جلدی سے آؤ۔" کنڈکٹر نے بس پر زور سے ہاتھ مار کر ڈرائیور کو روکنے کے لئے کہا۔ بابا کی سانس چڑھی ہوئی تھی بھاری بھاری قدم رکھتا وہ تیزی سے آ رہا تھا اُس کی بھدّی چال دیکھ کر کنڈکٹر ہنس دیا اور بولا "فکر نہ کرو باباجی۔ تمہیں لے کر ہی جائیں گے۔"
بس میں بیٹھے مسافر بھی بابا کا تماشا دیکھ کر مسکرانے لگے۔ بابا کبھی اِدھر گرتا کبھی اُدھر۔ اب وہ بس پر چڑھ گیا اور لڑکی بھی کُود کر اندر آ گئی۔ اُس کی بھی سانس چڑھی ہوئی تھی۔ وہ ہانپ کر بولی "بابا جی۔ میری چادر پر آپ کا پاؤں ہے۔ ذرا پاؤں کو اُٹھاؤ۔"
"صبر بھی کر لڑکی۔ شور مچا رہی ہے۔ قیامت تو نہیں آ گئی۔ یہ لے۔"
لڑکی نے چادر سر پر اوڑھی۔ کنڈکٹر نے ہاتھ پکڑ کر بابا کو ایک سیٹ پر بٹھایا۔ اور ساتھ والی پر لڑکی بیٹھ گئی۔ بس روانہ ہو گئی۔ ایک موڑ پر

بابا لڑکی کی طرف جھکا تو لڑکی نے بابا کے کان میں کہا۔ "ذرا دیکھ کر قدم اٹھایا کرو۔ تمہارے پاؤں کے نیچے آکر میری چادر کھینچ گئی تھی اور اُس کے ساتھ ہی میرا پراندہ بھی نکلنے ہی والا تھا۔"

بس تیزی سے نیچے جا رہی تھی۔ بابا نے خراٹے لینے شروع کر دیئے اور لڑکی کھڑکی سے باہر جھانک رہی تھی۔ وہ اپنے والدین کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ وہ اِس وقت کیا کر رہے ہوں گے اور اُن پر کیا بیت رہی ہوگی۔

پنڈی پہنچ کر یہ دونوں اینڈی کے گھر گئے جہاں سے انہوں نے حقّہ لینا تھا۔ اینڈی کی ماں اپنے کسی رشتہ دار کو ملنے گئی ہوئی تھی۔ بڑے خیال سے بابا نے گھر کا دروازہ کھولا۔ اور لڑکی کے کان میں کہا "ہم خوش قسمت ہیں کہ ہماری پڑوسن جمیلہ بھی یہاں نہیں ہے۔ اس وقت اگر وہ ہمیں یہاں دیکھ لے تو ہمیں چور ڈاکو ہی سمجھے گی۔ خُدا بچائے اُس سے۔ ذرا سی بات پر وہ تو چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا لیتی ہے۔"

دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوئے اور جلدی سے دروازہ بند کر لیا۔ اب اینڈی نے وہ چیزیں اکٹھی کرنی شروع کیں جن کی انہیں ضرورت ہوگی ایک بڑا سا تھیلا اور حُقہ اُس نے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ "اسکم، پہاڑی علاقہ میں رات کو بڑی ٹھنڈ ہو جاتی ہے۔ ہمیں چھوٹا سا بستر بھی ساتھ لے لینا چاہیئے۔"

سب چیزیں دیکھ کر اسکم نے بڑے فکر مند لہجہ میں کہا "یہ سب چیزیں اٹھائے گا کون؟ میں تو نہ ہی بستر اُٹھاؤں گا نہ ہی بڑا سا بورا۔"

"ارے نہیں اسکم۔ چھوٹی لڑکیاں ہی بستر سر پہ رکھ کر چلتی ہیں۔ میرے ہاتھ میں حُقہ ہی ہونا چاہیئے۔"

کافی دیر بحث مباحثہ کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ بابا حقّہ اور بورا اٹھائے گا۔ لڑکی کے سر پر بستر ہوگا اور وہ آگے آگے چلے گی اور اُس کے پیچھے پیچھے بابا آئے گا۔ اُس کے ایک ہاتھ میں بورا اور چھاتہ ہوگا۔ اور دوسرے میں حقّہ۔

جب وہ کمرے سے باہر نکلنے لگے تو بابا نے کہا۔ "ذرا ٹھہر جاؤ۔ میں جھانک کر دیکھتا ہوں کہ کوئی ہے تو نہیں"

وہ دیر تک سُنتے رہے لیکن باہر بالکل خاموشی تھی۔ بابا نے آہستہ آہستہ دروازہ کھولا اور اچھی طرح تسلّی کر لینے کے بعد بولا "جلدی سے باہر آجاؤ"

جب لڑکی باہر آگئی تو بابا نے اپنے ہاتھ اوپر اٹھائے کہ دروازے میں کُنڈی چڑھا کر تالہ لگا دے، لیکن نہ معلوم وہ اتنا گھبرا کیوں گیا کہ اُس کے ہاتھ کانپنے لگے۔

انسپکٹر بڑی ڈری ہوئی آواز میں بولا "جلدی کرو کوئی آرہا ہے میں لوگوں کے بولنے کی آوازیں سُن سکتا ہوں۔ ایسے لگتا ہے بہت سے آدمی اِدھر ہی آرہے ہیں"

انڈی اور بھی گھبرا گیا اور اِس گھبراہٹ میں تالہ اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر تڑاخ سے زمین پر آگرا۔

جمیلہ اپنی پوری آواز سے گلا پھاڑ کر چلانے لگی۔

"چور چور۔ ہائے بچاری بیوہ کو لوٹ لیا۔ پکڑو پکڑو"

بابا نے لڑکی کا ہاتھ پکڑا اور گھسیٹتا ہوا بولا "دوڑو۔ میرے پیچھے پیچھے تیزی سے بھاگو۔ اگر ہم پکڑے گئے تو سارا کام خراب ہو جائے گا"

بہت سے آدمی اُن کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ کسی نے بڑی حیرانی سے کہا۔ "بابا دوڑتا تو بڑا تیز ہے۔ لیکن بچ کے جائے گا کہاں؟"

بابا اور لڑکی پہلے تو اِدھر اُدھر گلیوں میں بھاگتے رہے پھر وہ گلی سے نکل کر بازار میں بھاگنے لگے۔ ایک موڑ پر سپاہی کھڑا ہوا تھا۔ دو ایک آدمیوں نے اُسے سارا ماجرا سنایا تو وہ بھی بابے کے پیچھے دوڑ پڑا۔ سپاہی تھا تو اُدھیڑ عمر کا مگر تھا قد کاٹھ کا مضبوط۔ جب وہ چڑھائی پر دوڑا تو جلد ہی اُس کی سانس پھول گئی اور کسی پرانے انجن کی طرح شُوں شُوں کرنے لگا۔

ابھی تک بابا اور لڑکی اپنے پیچھا کرنے والوں کے ہاتھ نہ آئے تھے۔ بابا تو خیر تیزی سے دوڑ ہی رہا تھا لیکن لڑکی کے سر پر بستر تھا۔ اور اب اُس کا سانس بھی اکھڑنا شروع ہو گیا تھا۔ پیچھے مُڑ کر جو اُس نے دیکھا تو وہ چلّا اٹھی۔ "اب تو ایک سپاہی بھی ہمیں پکڑنے آ رہا ہے۔ بابا جلدی کر ہمیں بچا لے"

ہانپتے ہوئے سپاہی نے اُن سے کہا "اب بچ کر کہاں جا سکتے ہو؟" سپاہی بالکل نزدیک آ پہنچا تھا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے یہ نقشہ گھوم رہا تھا کہ اُس نے ایک بہت خطرناک ڈاکو کو گرفتار کیا ہے۔ اُسے بہت انعام دیا جا رہا ہے اور وہ تھانیدار بن گیا ہے۔ بس دس قدم میں وہ ان خطرناک مجرموں کو پکڑے گا۔ عین اُسی وقت ایک جنگلی کُتا سپاہی پر جھپٹا۔ ہوا یوں کہ وہ کُتا سڑک کے کنارے لیٹا ہوا تھا۔ سپاہی نے اپنے جوش میں اُس کا خیال نہ کیا اور اُس کی دُم پر اُس کا پاؤں جا پڑا۔ اِس ناگہانی آفت سے بچنے کے لئے جو اُس نے گھوم کر پیچھے کی طرف دیکھا تو وہ گند کے ایک ڈھیر پر جا گرا۔ بچارے کی وردی خراب ہو گئی اور وہ دو ایک منٹ بالکل بے حِس و حرکت زمین پر پڑا رہا۔ بھاگنے والوں کو اب سپاہی کی فکر لگ گئی اور تھوڑی دیر تک تو انہیں اُن دو چوروں کا خیال ہی نہ رہا۔ بابا اور

لڑکی کے لئے یہ ایک سنہری موقع تھا۔ اِسی دوران وہ کافی آگے نکل چکے تھے اب انہیں ایک بس نظر آئی۔ بابا نے زور زور سے ہاتھ ہلا ہلا کر کہا "روکو روکو"۔ بس کے ڈرائیور نے فوراً بس روک لی۔ کنڈکٹر نے ہاتھ بڑھا کر دونوں کو اندر کھینچا اور بس روانہ ہو گئی۔

جب وہ سیٹوں پر بیٹھ گئے تو بابا نے گھوم کر کھڑکی میں سے اپنے تعاقب کرنے والوں کو دیکھا۔ اور مسکرائے بغیر رہ نہ سکا۔ بہت سے لوگ بس سٹاپ پر حیران پریشان کھڑے تھے۔ سب ہی بُری طرح ہانپ رہے تھے۔ سپاہی بھی اُن کے آگے کھڑا تھا اور اپنے گھٹنے کو مل رہا تھا۔ شاید اُسے چوٹ لگ گئی تھی۔ غصّہ میں سر ہلاتے ہوئے اُس نے جیب سے ایک کاپی نکالی اور جلدی جلدی اُس میں کچھ لکھنے لگا۔ شاید بس کا نمبر لکھ رہا تھا۔

بابا نے لڑکی کی طرف دیکھا اور اطمینان کا سانس لیا۔

"ٹکٹ۔ جناب کہاں جائیں گے؟" کنڈکٹر اُن کے سر پر کھڑا تھا۔

"لاری اڈہ کے دو ٹکٹ"

کنڈکٹر نے سر ہلا کر کہا "یہ بس اُدھر نہیں جاتی۔ آپ اگلے سٹاپ پر اُتر کر سڑک کے دوسری جانب کھڑے ہوں۔ لاری اڈہ کو جانے والی بس اُدھر ملے گی"

کنڈکٹر کے آگے بڑھ جانے پر اسلم نے اپنے دوست سے کہا۔

"بال بال بچ گئے۔ اب ہمیں بڑا ہوشیار رہنا چاہیئے"

ابھی وہ بس سے اُتر کر دوسری جانب پہنچے ہی تھے کہ اڈہ جانے والی بس آگئی اور وہ اُس میں سوار ہو کر خاموشی سے اپنی سیٹوں پر بیٹھ گئے۔ جب بس اڈے پر پہنچی تو انہوں نے اُترنے میں جلدی نہ کی بلکہ تسلی سے اِدھر اُدھر

نظر دوڑا کر اطمینان کر لیا کہ کوئی خطرہ تو نہیں۔ بس سے اُتر کر وہ جلدی جلدی اُس طرف بڑھے جہاں سے پشاور کو بسیں جاتی تھیں۔ ایک بس بالکل تیار کھڑی تھی۔ انہیں اُس میں سیٹیں مل گئیں۔ وہ پھُرتی سے اندر بیٹھ گئے۔ ذرا سی دیر بعد بس روانہ ہو گئی۔ تو اُن کی جان میں جان آئی۔

یہ بس انہیں پشاور لے گئی یہاں انہوں نے لنڈی کوتل جانے والی بس پکڑی اور جو کچھ چارلی نے اسلم کو بتایا تھا عین اُسی طرح کیا۔ لنڈی کوتل سے ذرا پہلے ریلوے پھاٹک کے پاس وہ اُتر گئے۔ اور بڑے احتیاط سے پہاڑی کی اُس طرف چلنا شروع کر دیا جہاں چارلی نے اسلم کو بتایا تھا کہ وہاں اُس کا بنگلہ بیت القمر ہے۔

باب ۷

بیت القمر ایک بہت بڑا بنگلہ تھا۔ اِس کے چاروں طرف اونچی اونچی دیوار تھی، جس کی وجہ سے یہ بالکل چھُپا ہوا تھا اور نہ ہی اِس عالیشان بنگلے کی طرف کبھی کسی نے دھیان دیا تھا۔ چونکہ یہ جگہ بھی بڑی ویران سی تھی اِس لئے یہاں کبھی کبھار ہی کوئی آتا تھا۔

گذشتہ چار روز سے ایک بوڑھا اور ایک کم عمر لڑکی اِس مکان کے قریب آ نکلتے اور نزدیک کی پہاڑی پر بیٹھ کر سارا دن گذار دیتے۔ اس پہاڑی سے وہ بیت القمر کے صحن کے اندر بڑی آسانی سے سب کچھ دیکھا جا سکتا تھا۔ بابا اور لڑکی وہاں ہی بیٹھے نظر آتے۔ کبھی کبھی لڑکی اُٹھ کر اپنی دو بکریوں کے پیچھے جاتی جو نزدیک ہی چر رہی ہوتی تھیں۔ یہ دو بکریاں وہ اپنے ساتھ ہی یہاں لاتے تھے۔

پہلے کچھ دن تو چارلی اِن دونوں کو بڑے غور سے دیکھتا رہتا اور حیران ہوتا کہ وہ اُس جگہ کیوں آ کر بیٹھتے ہیں۔ ایک دن اُس نے اپنے نوکر کو اُن کے پاس بھیجا کہ وہ جا کر دریافت کرے کہ اُن کے اِس جگہ آنے کا مقصد کیا ہے۔ نوکر جب واپس آیا تو ہنس ہنس کر چارلی کو بتانے لگا: "خان، اُن سے

مت گھبراؤ۔ بڈھا تو اپنی دنیا میں ہی مست ہے۔ اُس کے پاس حقّہ ہے اور وہ سارا دن کش پہ کش لگاتا رہتا ہے۔ وہ چھوکری تو بالکل پاگل ہے وہ تو میرے ایک سوال کا جواب نہ دے سکی۔ جب مَیں نے اُس سے بولنے کی کوشش کی تو اُس نے شرم کے مارے اپنے منہ کو چادر سے چھپا لیا اور بابا کے پیچھے چھپ گئی۔ بالکل پاگل ہے۔"

یہ سن کر چارلی قدرے مطمئن ہوا لیکن پھر بھی اُس نے اُس آدمی کو نصیحت کی کہ جس طرح بھی ممکن ہو وہ اِن دونوں کو اُس جگہ آنے سے روک دے۔

"ابھی تو وہ دن کو یہاں آتے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ رات بھی اس پہاڑی پر گذارنے لگیں۔ یہ بالکل نہیں ہونا چاہیئے۔ بس کسی نہ کسی رات ہمارا مال بھی آنے والا ہے۔ اُنہیں یہاں سے بھگا دو۔"

اِس وقت چارلی نے پھر پٹھانوں والے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ جب اسلم پہلی بار شاہدرہ کے پار اُسے ملا تھا تو اُس وقت اُس نے بالکل وہی پہنے ہوئے تھے۔ اُسی وقت ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔

چارلی نے جلدی سے فون اُٹھایا۔ اُس کا خیال تھا کہ مال آ رہا ہے اور اُس کے حصّہ دار نے اُسے فون کیا ہے۔ لیکن چارلی کے چہرے کی رنگت اُڑتی جا رہی تھی۔

"کیا کہا..... ؟ اوے بیوقوف یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ کیا تو مر گیا تھا کہ لڑکا ہوٹل سے غائب ہو گیا ہے ؟"

ویلی ویو ہوٹل میں چارلی کا جو جاسوس مقرر تھا، اُس نے دانتوں سے اپنا ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔ "میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔ سارا وقت ہی میں اُس کی چوکیداری کرتا رہا ہوں۔ میں نے تو اُسے ہوٹل سے باہر جاتے نہیں دیکھا۔"

"وہ کب سے وہاں نہیں ہے ؟" چارلی نے گرج کر پوچھا۔

"پیر کے دن سے۔ اب تک تو میں انتظار کرتا رہا کہ شاید وہ واپس آجائے لیکن آج تیسرے دن بھی جب وہ واپس نہیں آیا۔ تو میں جناب کو اطلاع دے رہا ہوں۔"

"شرم کر بیوقوف۔ ایک چھوکرا تمہیں اُلّو بنا گیا میں تمہارے مکان کو آگ لگا دوں گا۔" اور یہ کہہ کر زور سے ٹیلیفون بند کر دیا۔ وہ دیر تک اُسی جگہ کھڑا خلا میں گھورتا رہا۔ اُس کی زندگی میں آج تک ایسا نہیں ہوا تھا۔ "شاید لڑکا میرے کاروبار سے واقف ہو گیا تھا اور خاموشی سے وہاں سے بھاگ نکلا ہے۔ یہاں میں اِن گدھوں سے کام لے رہا ہوں اور اُدھر اُس بیوقوف کے ہاتھ سے شکار نکل گیا ہے۔" اب ایک بڑی عیّارانہ مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر پھیلتی نظر آئی اور اُس نے میز پر ہاتھ مار کر کہا "بچ کر کہاں جائے گا؟ میں جانتا ہوں کہ کس طرح تجھے ڈھونڈ نکالوں گا۔"

پھر وہ کھڑکی کے نزدیک آ کھڑا ہوا۔ وہاں سے بابا اور لڑکی صاف نظر آ رہے تھے۔ "واہ۔ کتنی آرام کی زندگی گذار رہے ہیں۔ بس سارا دن بیٹھے خواب دیکھتے رہتے ہیں۔ کل ہی میں اپنے کتّے اُن پر چھوڑوں گا اور وہ انہیں یہاں سے دور بھگا دیں گے۔ انہوں نے تو یہاں ڈیرا ہی ڈال لیا ہے۔"

جلّی کو بھلا کیا پتہ تھا کہ اُس وقت وہ دونوں بھی اُس کے بارے میں بات چیت کر رہے تھے۔ وہ معلوم تو ایسے دیتے تھے جیسے انہیں اِس دُنیا کا کچھ پتہ ہی نہیں ہے۔ لیکن وہ پل پل کی بات کا زبردست دھیان رکھتے تھے۔ اُس پہاڑی پر سے جو کچھ بھی بنگلے کے اندر ہو رہا ہوتا تھا وہ بڑی آسانی سے دیکھ سکتے تھے۔

اب جب چارلی صحن میں کھڑا نظر آیا تو اسلم کی تو گویا جان ہی نکل گئی۔ بار بار اُسے یہ خیال آتا کہ اگر وہ اُن کے پاس آگیا تو پھر تو اُن کا سارا بھرم کھُل جائے گا۔

اسلم نے اپنے دوست کے کان میں کہا۔ "اس مکان میں کوئی نہ کوئی راز ضرور چھپا ہوا ہے۔ یاد ہے نا۔ لنڈی کوتل میں لوگ کہہ رہے تھے کہ دارا اس بنگلے کو خریدنے کے لئے دیوانہ ہو گیا تھا۔ اِس لئے اُس نے اس جگہ کے منہ بولے دام ادا کئے تھے۔"

بابا کو بھی یاد آیا کہ لنڈی کوتل میں جب وہ دو بکریاں خرید رہے تھے تو انہوں نے باتوں باتوں میں بیت القمر کے بارے میں اِدھر اُدھر پوچھا تھا اس طرح انہیں یہ تو پتہ چل گیا تھا کہ بیت القمر کا مالک تو چارلی ہی ہے، لیکن وہ کرتا کیا ہے یہ کسی کو معلوم نہ تھا۔

"ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ اُس بنگلے میں اتنے مستری کیوں ہیں تھوڑی تھوڑی دیر بعد کوئی نہ کوئی آدمی ہاتھ میں اوزار پکڑے صحن میں آتا ہے۔ دو ایک منٹ سگریٹ پی کر وہ پھر غائب ہو جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ کسی تہہ خانہ میں کام کرتے ہیں اور کھلی ہوا میں ذرا دیر سانس لینے آتے ہیں۔ کیا وہ کوئی زمین دوز کارخانہ ہے یا سمگلنگ کرنے کا خفیہ سنٹر ہے؟"

بابا کی نظریں صحن پر ہی لگی ہوئی تھیں۔

اب اُن کی توجہ ایک خاص انسان پر لگ گئی، جو پہلے تو بڑا معمولی سا نظر آتا تھا۔ اِس لئے انہوں نے کبھی اُس کی طرف دھیان نہیں دیا تھا۔ لیکن اب وہ بار بار اُن کے سامنے آتا تھا۔ وہ ایک بوڑھا فقیر تھا جو پھٹے پرانے

کپڑے پہنے رہتا۔ بلا ناغہ وہ ہر روز اُدھر آتا۔ ہاتھ پھیلا کر بھیک مانگتا ہوا دیوار کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے وہ ایک چھوٹے سے پھاٹک کے قریب پہنچا تو دروازہ ایک دم کھُل جاتا اور فقیر صحن میں غائب ہو جاتا۔

بابا نے لڑکی کے کان میں کہا "یہ فقیر بھی اُنہی کے گروہ کا ایک آدمی ہے چارلی خود اُس کے لئے دروازہ کھولتا ہے۔ آج تو ہم نے صاف دیکھا تھا کہ چارلی اُسے لے کر اندر گیا تھا۔"

"اور ایک تو چارلی بڑی بے صبری سے ہر روز اُس کے انتظار میں ہوتا ہے۔ وقت سے بہت پہلے وہ پھاٹک کے قریب آکھڑا ہوتا ہے۔" لڑکی نے بھی بابا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

بابا نے اپنی پگڑی سر پر درست کی اور کہا۔

"مجھے یقین ہے کہ کچھ نہ کچھ ضرور ہونے والا ہے۔ کاش ہم اِن ڈاکوؤں کو کسی طرح پکڑا سکیں!"

لڑکی بھی دل و جان یہی چاہتی تھی۔ کیونکہ اب گھر جانے کی ایک زبردست خواہش اُس کے دل و دماغ میں بس گئی تھی۔ بعض اوقات تو وہ بڑی مایوس ہو کر سوچنے لگتی تھی کہ کیا کبھی وہ خیر خیریت سے اپنے گھر پہنچ بھی سکے گی! بعض اوقات وہ خواب میں دیکھتی کہ وہ چارلی کی قید میں ہے۔ ہر صبح جب وہ غار سے باہر نکل کر اُس پہاڑی کی طرف جانے لگتے تو رہ رہ کر اُس کے دل میں یہ خیال آتا کہ نہ معلوم آج رات ہمیں اِس غار کی طرف لوٹنا نصیب ہوگا یا نہیں۔ نہ معلوم آج موت ہمارے انتظار میں ہی ہو۔

"بابا جی" اُس نے ڈری ہوئی آواز میں پوچھا۔ "کیا آپ کو موت سے ڈر نہیں لگتا؟"

بابا نے سر ہلا کر کہا "ہاں، ڈر کیسے نہیں لگتا۔ مرنا کوئی آسان یا پُر لطف چیز تو ہے نہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ موت کی گھڑی میں خدا میری بڑی مدد کرے گا۔ کیونکہ میں تو موت کے بعد کی زندگی کا منتظر ہوں۔ اصلی زندگی تو مرنے کے بعد شروع ہوتی ہے۔ کیونکہ اُس بہترین زندگی میں نہ دُکھ ہوگا نہ درد۔ نہ بھوک ہوگی نہ غم، نہ محنت مشقت ہوگی اور نہ ہی کسی چیز کا ڈر ہوگا۔"

لڑکی کے دل میں زبردست خواہش پیدا ہوئی کہ وہ بھی ایسی زندگی حاصل کرلے۔ اُس وقت اُس کے سر میں شدید درد ہو رہا تھا اور حقیقت تو یہ ہے کہ جس دن سے وہ یہاں آئی تھی، کچھ بیمار سی رہتی تھی۔ دراصل اُسے یہ ڈر ہر وقت ستاتا رہتا تھا کہ اگر وہ اِس ویران سنسان جگہ میں بیمار ہوگئی تو پھر کیا ہوگا۔

اُس نے اپنی کنپٹی دباتے ہوئے پوچھا۔ "بابا جی، تمہیں کس طرح یہ یقین ہے کہ ضرور آسمان میں جاؤ گے؟ جب میں اپنے بارے میں سوچتی ہوں تو میرا تو یہ خیال ہوتا ہے کہ میں اُس جگہ کے ہرگز لائق نہیں ہوں۔ میں نے بھلا کونسی نیکیاں کی ہیں کہ خُدا مجھے جنت میں داخل ہونے کی اجازت بخشے۔"

"ارے میاں! کوئی شخص بھی اپنے نیک اعمال سے خُدا تک رسائی حاصل کرسکتا ہے؟" اِس وقت بابا یہ بالکل بھول گیا کہ اُسے بوڑھوں جیسی آواز میں بولنا چاہیئے بلکہ اینڈی والے لب و لہجہ میں یوں بولا۔

"یہ بالکل غلط ہے۔ خُدا تو صرف اُن آدمیوں کو اپنے قریب آنے دے گا جو بڑے پاک صاف ہوں گے کیونکہ وہ خود پاک خُدا ہے۔ وہ ایسے آدمیوں کو آسمان میں ہرگز داخل ہونے کی اجازت نہیں دے گا جو خود غرض، کینے یا تیز مزاج ہیں۔ اِس قسم کے بُرے لوگ تو جنّت کو بالکل خراب کردیں گے۔"

لڑکی نے فوراً سوال کیا۔

"تو جیسے تم نے ابھی کہا ہے کہ صرف گناہ سے پاک آدمی وہاں جا سکتے ہیں تو پھر مجھے یہ بتاؤ کہ نیک کون ہیں؟"

"میں اسی طرف آرہا تھا"، بابا نے ترچھی نگاہوں سے لڑکی کی طرف دیکھا۔ "کوئی بھی گناہ سے پاک نہیں ہے کیونکہ پاک کلام میں یوں لکھا ہوا ہے۔ سب نے گناہ کیا اور خدا کے جلال سے محروم ہیں، اب اس مقام پر ہماری مدد کو حضرت عیسیٰ مسیح آموجود ہوتے ہیں۔ خدا کا حکم ہے، جو جان گناہ کرتی ہے۔ ضرور مرے گی، حضرت عیسیٰ مسیح نے ہماری جگہ موت برداشت کی۔"

"ارے واہ۔ یہ کیسے ممکن ہے؟" لڑکی یکدم بول اٹھی "بھلا اس سے کسی کو کیا فائدہ پہنچتا ہے؟"

بابا نے جواب دیا "اگر کوئی مان جائے کہ میں گنہگار ہوں تو وہ صدق دلی سے مسیح پر ایمان لائے کہ انہوں نے اس کے بدلے سزا برداشت کی ہے اور اس کے لئے ان کا شکریہ بجا لائے۔"

"لیکن اس سے ایک آدمی پاک کیسے بن سکتا ہے؟"

"وہ اس طرح کہ اگر کسی مسیح پر ایمان رکھنے والے کو اپنے قصوروں پر شرمندگی ہو اور اُسے اپنے کئے پر افسوس ہو تو خُدا اسے معاف کر دے گا۔ جب بھی اُس شخص سے گناہ سرزد ہو اور وہ پچھتا کر خُدا سے معافی مانگے تو خدا اسے معاف کر دیتا ہے اور پھر مسیح پر ایمان رکھنے والے کے دل میں وہ پاک روح بھی تو بسا ہوا ہے جس کے بارے میں میں نے پہلے بھی تمہیں بتایا تھا۔ پاک روح ایک بہت بڑا اُستاد ہے۔ وہی بار بار جتاتا رہتا ہے کہ تم گناہ نہ کرو۔"

"تو پھر؟" لڑکی نے پہلو بدلا۔ "جب ایک اِس قسم کا مسیحی مر کر آسمان پر جاتا ہے تو کیا خُدا اُسے آسمان میں آنے دے گا؟" کیا وہ اُسے یہ نہیں کہے گا کہ "اینڈی، مجھے تم بالکل پسند نہیں ہو۔ میرا تو خیال تھا کہ تم اچھے لڑکے ہو گے لیکن تم تو ابھی تک بڑے تیز مزاج ہو۔ اور پھر تم میں مال دولت کا لالچ بھی بہت ہے۔"

"نہیں ایسا نہیں ہو گا۔" اینڈی نے جواب دیا۔ "اس لئے نہیں کہ میں ایک بڑا پارسا شخص ہوں۔ بلکہ اس لئے کہ مسیح نے میرے لئے اپنا خون بہایا تھا۔ اُس نے میرے لئے میری سزا بھگت لی۔

"یہ تو بڑی گہری باتیں ہیں۔" لڑکی نے سامنے پہاڑ کی چوٹی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اب کافی دیر تک دونوں خاموش رہے۔ وہ اپنے اپنے خیال میں ڈوبے ہوئے تھے۔

رات کی سیاہی پھیل رہی تھی۔ عموماً وہ اِسی وقت رات بسر کرنے کے لئے اپنی غار کی طرف چل دیتے تھے لیکن آج نہ جانے کیا وجہ تھی کہ وہ اپنی جگہ سے نہ اُٹھے۔ فقیر ابھی تک نہیں آیا تھا۔ شاید آج کوئی خاص بات ہے۔ کیا وہ اِس انتظار میں ہے کہ ہر طرف اندھیرا چھا جائے؟

آخر اُنہیں دُور ایک سایہ بڑھتا ہوا نظر آیا۔ یہ وہی فقیر تھا جو بڑے لمبے لمبے قدم اُٹھا رہا تھا۔

لڑکی نے اُس کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "وہ رہا وہ بوڑھا فقیر۔ ایک بوڑھا اور لنگڑا اتنا تیز چل سکتا ہے؟"

بابا نے بھی سر ہلایا اور لڑکی سے کہا۔ "آؤ۔ ہم بھی سرکتے ہوئے اُس

پھاٹک تک پہنچتے ہیں۔ شاید ہم اُن کی بات چیت سُن سکیں۔"

آہستہ آہستہ وہ ڈھلوان پر نیچے آئے۔ وہ چارلی کی نظروں سے پوشیدہ تھے کیونکہ چارلی دروازے کی اوٹ میں کھڑا بے صبری سے فقیر کا انتظار کر رہا تھا۔ اِن کے دل تیزی سے دھڑک رہے تھے۔ بڑی ہوشیاری سے وہ پھاٹک کے قریب ایک پتھر کے پیچھے پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔

فقیر دروازے کی طرف بڑھا چلا آ رہا تھا اور چلتے چلتے اُونچی آواز میں بھیک مانگ رہا تھا۔ بار بار وہ اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر کسی چیز کو ٹٹولتا اور پھر آگے بڑھتا۔ ایک مرتبہ جب اُس نے اپنی جیب سے ہاتھ باہر نکالا تو تہہ شدہ ایک کاغذ کا ٹکڑا اُس کی جیب سے باہر گر گیا۔ بابا نے کاغذ گرتے دیکھ لیا تھا۔ جونہی فقیر اُن سے آگے نکلا بابا تیزی سے باہر نکلا۔ کاغذ ہاتھ میں دبوچا اور واپس پتھر کے پیچھے آ گیا۔

عین اُسی وقت پھاٹک کھُلا اور چارلی غصّہ میں گرجا۔

"اتنی دیر کیوں لگائی؟ کیا پیغام لائے ہو؟ کہاں ہے وہ کاغذ؟"

فقیر بار بار اپنی جیبیں ٹٹولتا اور گھبرائی ہوئی آواز میں بولتا "کاغذ میرے پاس ہی تھا..... میری جیب میں ہی تھا۔ ابھی دو منٹ پہلے بھی میری جیب میں تھا۔ اب نہ معلوم کہاں گیا ہے؟"

غصّہ میں چارلی پاگل ہو رہا تھا۔ اُس نے زور زور سے بابا کی سب جیبوں کی تلاشی لی۔ بلکہ ساری جیبیں ہی پھاڑ ڈالیں لیکن کچھ ہوتا تو ملتا۔ دانت پیستے ہوئے اُس نے ایک زوردار تھپڑ اُس کے مُنہ پر مارا اور کہا۔

"اب ہمیں اُس سارا راستہ میں اُس کاغذ کو ڈھونڈنا ہو گا جس راستہ سے تم یہاں آئے ہو، بد بخت انسان۔"

پتھر کے پیچھے جب اِن دونوں نے یہ سُنا تو اُن کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔

لڑکی نے بابا کے کان میں کہا "خدا کے لئے کاغذ لے کر یہاں سے غائب ہو جاؤ۔ یہ کاغذ کسی بھی قیمت پر اُن کے ہاتھ نہیں لگنا چاہیئے۔ ہمارے پاس اب ایک بڑا ثبوت ہے کہ یہ شخص خطرناک مجرم ہے۔"

"آؤ دونوں بھاگ ....."

لیکن چارلی اُن کے سر پر کھڑا تھا۔ اُس نے لڑکی کا ہاتھ زور سے پکڑ کر کہا۔ "تو یہاں کیا کر رہی ہے؟ کیا تیرے پاس وہ کاغذ نہیں ہے؟ ارے لڑکی تُو نے تو کوئی کاغذ نہیں دیکھا؟"

چارلی لڑکی کے ہاتھ کو جھٹکے دے رہا تھا جو زمین پر گری ہوئی تھی اور وہ اندھیرے میں بار بار اُسے جھنجھوڑتا۔

بابا سر پر پاؤں رکھ کر وہاں سے دوڑا اور اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ چارلی نے اپنے ساتھیوں کو چاروں طرف دوڑایا۔ لیکن بابا کسی کے ہتھے نہ چڑھا۔ وہ بھاگتا ہی چلا گیا، یہاں تک کہ اُس کی پسلیاں دُکھنے لگیں اور دل اتنی تیزی سے دھڑک رہا تھا گویا ابھی حلق سے باہر آجائے گا۔ لیکن ایک غیبی طاقت اُس کی مدد کر رہی تھی اور وہ فوراً ہی اُن کی پہنچ سے باہر ہو گیا۔

باب ۸

اسلم جس نے لڑکیوں والے کپڑے پہنے ہوئے تھے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ خوف سے اُس کے دانت بھی بجنے لگے۔ اُس نے ہاتھ جوڑ کر لڑکیوں کی سی آواز میں کہا "مجھے جانے دو۔ مجھے جانے دو۔ میں نے کیا قصور کیا ہے؟"

چارلی کے ساتھی واپس آ چکے تھے۔ وہ بابا کو پکڑنے میں ناکام رہے تھے۔ اب وہ سب اُس لڑکی کے گرد حلقہ بنا کر کھڑے ہو گئے اور غور سے اُس کی طرف دیکھنے لگے۔

"کیا قصور کیا ہے؟" چارلی نے اُس کی نقل اُتارتے ہوئے کہا "قصور تو کچھ نہیں کیا۔ تمہارے جیسے لوگ تو کبھی بھی کوئی قصور نہیں کرتے ہیں۔ وہ کاغذ کہاں ہے؟"

"خدا کی قسم میرے پاس کوئی کاغذ نہیں ہے۔"

چارلی نے پھر اُسے دو چار زوردار جھٹکے دیئے "پہلے تو تم دن میں یہاں آتے تھے اور اب رات بھی یہیں ڈیرا ڈال دیا ہے۔" پھر لڑکی کو دروازے کے اندر گھسیٹ کر لے گیا اور اونچی آواز میں بولا "میں تمہاری تلاشی لوں گا۔ کاغذ تمہارے ہی پاس ہے۔ گل خان، میرے کمرہ میں بڑا بلب

روشن کر دو۔"

اسکم اپنے ہونٹ کاٹنے لگا۔ دل میں سوچ رہا تھا کہ اب تیز روشنی میں وہ چارلی کے سامنے اکیلا ہوگا؟

چارلی لڑکی کو گھسیٹتا ہوا اپنے کمرے میں لے آیا۔ اور ایک طرف دھکا دیتے ہوئے کہا "اپنے ہاتھ اوپر اٹھا لو۔ میں تمہاری تلاشی لوں گا۔ اگر کاغذ تمہارے پاس نہ نکلا تو میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔ لیکن خبردار مجھ سے کوئی چالاکی نہ کھیلنا ورنہ گولی مار دوں گا۔ ہاں تو بولو۔ تمہارے پاس وہ کاغذ ہے؟"

اسکم نے چادر سے اپنے سر کو دھانکتے ہوئے کہا "نہیں جناب..... میرے پاس کوئی کاغذ نہیں ہے۔"

چارلی بڑا حیران تھا۔ اس لڑکی کی آواز جانی پہچانی معلوم دیتی تھی اور یہ آنکھیں بھی اُس نے پہلے کبھی دیکھی تھیں۔ خاص طور پر لفظ "جناب" پر تو اُسے بڑی حیرت سی ہوئی۔ اُس نے لڑکی کا منہ روشنی کی طرف کیا اور سر سے چادر اُتار دی تو ساتھ ہی بالوں میں لگا ہوا پراندہ بھی علیحدہ ہوگیا لڑکی کے بھیس میں اسکم اُس کے سامنے کھڑا تھا۔

"تم!!! اسکم!!! تو تم نے اتنی جلدی بھیس بدلنا سیکھ لیا ہے؟"

غصہ میں چارلی کی سانس چڑھ گئی۔ ایک زناٹے دار تھپڑ اُس کے منہ پر رسید کرتے ہوئے بولا۔ "مجھے بیوقوف بناتے ہو؟ لیکن میں اتنی کچی گولیاں نہیں کھیلا ہوں۔" اسکم کا سر دیوار سے جا ٹکرایا اور وہ ڈری ہوئی نظروں سے چارلی کی طرف دیکھ رہا تھا کہ اب وہ اگلا قدم کیا اُٹھائے گا۔

"لڑکے۔ سچ سچ بتا۔ میرے بارے میں تجھے کیا معلوم ہے؟"

اسکم نے رُکتے رُکتے کہا۔ "میں سچ کہتا ہوں کہ مجھے آپ کے بارے

میں کچھ پتہ نہیں ہے۔"

"تو پھر تم اِس جگہ جاسوسی کرنے کیوں آئے تھے؟" جلدی بولو۔

گہری خاموشی میں ٹیلیفون کی گھنٹی بڑی اونچی آواز سے بجی۔ اسلم چونک سا گیا۔ چارلی اُسے ایک اور تھپڑ مارنے ہی والا تھا کہ اُس نے اپنا ہاتھ روک لیا اور ٹیلیفون کی طرف لپکا۔

"جی..... مَیں بول رہا ہوں..... بس مَیں پہنچا۔ سب ٹھیک ہے نا؟ بہت اچھا... آدھ گھنٹہ میں ملاقات ہوگی۔"

چارلی نے فون بند کر دیا اور اسلم کے قریب آکر کہا۔ "افسوس ہے کہ مجھے باہر جانا ہے ورنہ ابھی تیری یہاں چمڑی کھینچ لیتا۔ گل خان۔ اِسے لے جاؤ اور نیچے تہہ خانے میں بند کر دو۔ خبردار یہ یہاں سے بھاگنے نہ پائے۔"

پھر دو چار منٹ کمرے میں ٹہلتا رہا۔ وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ اچانک وہ اسلم کے سامنے رُکا اور اُس کو مخاطب کر کے بولا۔

"تہہ خانے میں تمہارے لئے بستر لگا دیا جائے گا اور وہاں کھانا بھیج دیا جائے گا۔ سُنو مَیں پھر تمہیں کہتا ہوں کہ اب بھی میری نوکری کر لو۔ کل بارہ بجے تک اپنا فیصلہ کر لو۔ اگر انکار کیا تو تمہیں گولی مار دی جائے گی۔ سمجھ گئے نا؟"

اسلم کانپ رہا تھا۔ وہ کچھ بول نہ سکا۔ صرف سر ہلا کر "ہاں" کہا۔ دل میں دعا کر رہا تھا کہ اینڈی جلد ہی مدد حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے۔

جب چارلی کا ایک ساتھی ہاتھ میں پستول لئے اسلم کو کمرے سے باہر لے جانے لگا تو اچانک چارلی کو اُس بابا کا خیال آیا۔ "رُک جاؤ۔ تمہارے ساتھ وہ بابا کون تھا؟"

اسلم نے اُس کی طرف مُنہ کرکے جواب دیا "وہ اینڈی ہے۔ ویلی ویو ہوٹل کا ایک ملازم"۔

"کیا کسی اَور کو بھی معلوم تھا کہ تم کہاں جا رہے تھے؟"

"نہیں جی ..... بالکل نہیں"۔

"فکر نہیں۔ اینڈی اگر پولیس کو بتا بھی دے تو وہ اُس چھوکرے کا کبھی اعتبار نہیں کریں گے۔ نہ ہی اُنہیں یہاں کچھ ملے گا"۔

تہہ خانے میں اسلم کو ایک چھوٹے سے کمرے میں بند کر دیا گیا "شکر ہے چارلی نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ بابا کے پاس تو وہ کاغذ نہیں"۔ پھر وہ دل میں دُعا کرنے لگا کہ جلد ہی اینڈی مدد حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ وہ اندھیرے میں گھبرا رہا تھا۔ کمرے میں بڑی گھٹن سی تھی اور بدبُودار تیل کی سڑاند آ رہی تھی۔ بتی کی روشنی ٹمٹمانے لگی۔ شاید اُس میں تیل ختم ہو رہا تھا۔ وہ اِس خیال سے لرز گیا کہ اگر بتی بُجھ گئی تو پھر کیا ہوگا۔ وہ اندھیرے میں کس طرح رہ سکے گا! اُس کے دل میں یہ بھی خیال آیا کہ نہ معلوم چارلی کا کیا دھندا ہے اور وہ کس طرح اُس کے ساتھ کام کرنے میں رضامند ہو "اگر میں اس اندھیرے میں مر گیا!!! کاش مجھے بھی اس بات کا یقین ہو..... اینڈی اِس بات کو پورے دل سے مانتا ہے کہ اُس کا ایک دوست ہے جو مشکل وقت میں اُس کا ساتھ دیتا ہے۔ کاش وہ دوست میرا دوست بھی ہو۔ شاید اینڈی کا وہ دوست اس وقت میری مدد کرے کہ میں چارلی کو کیا جواب دوں۔ کاش اینڈی کا دوست میری مدد کرے تاکہ میں چارلی کو صاف صاف کہہ دوں کہ مَیں اُس کی نوکری نہیں کرنا چاہتا"۔ وہ دل میں کہنے لگا "کاش میں گھر سے نہ بھاگتا۔ تو اِن مشکلات میں نہ پھنستا"۔

بتی دو ایک مرتبہ ٹمٹمائی اور بجھ گئی۔ اب گھپ اندھیرا تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ سوجھائی نہ دیتا ہے۔ گہری تاریکی تھی۔ اسلم بستر پر خاموشی سے لیٹا ہوا سوچ رہا تھا۔ "لاہور میں ہمارا گھر کتنا شاندار ہے۔ میں کتنی آزادی سے اپنے چمن میں گھوم پھر سکتا تھا۔ مجھے کسی بات کی فکر نہ تھی نہ ہی مذہب سے کوئی دلچسپی تھی اور نہ ہی کبھی نماز پڑھی تھی۔ یہ درست ہے کہ جب مجھے مجبور کیا جاتا تو میں روزے بھی رکھتا اور نماز بھی پڑھتا تھا۔ لیکن اس میں کبھی میرا دل نہیں لگا۔ اور اب تو شاید مجھے موقع ہی نہ ملے کہ سچائی کی اور خدا کی تلاش کر سکوں۔"

نہ معلوم وہ مذہب سے کیوں اتنا دور اور بیزار تھا۔ اب اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ مذہب کے بارے میں وہ کتنی خالی خولی باتیں کہنے کا عادی تھا۔ جب کوئی اُس سے پوچھتا "کیا حال ہیں تمہارے؟" تو وہ جھٹ جواب دیتا "آپ کی دعا سے بالکل ٹھیک ہوں"۔ لیکن کیا حقیقت میں اِس کا کوئی مطلب تھا؟ کیا اُس نے کبھی نماز پڑھی تھی یا دعا مانگی تھی؟ تو پھر اِن ظاہرہ اور دکھاوے کی باتوں کا کیا فائدہ جن میں کوئی حقیقت ہی نہ ہو۔ اُس نے ذرا اونچی آواز میں کہا۔ "اگر مجھے زندہ رہنے کا ایک موقع ملا تو جو الفاظ میں زبان سے نکالوں گا اُن پر عمل بھی کر کے دکھاؤں گا۔"

اب اُسے اپنی بہن ثریا کا خیال آیا جو اپنے آپ کو کچھ اور ہی ظاہر کرنے کی کوشش کیا کرتی تھی۔ پھر اُس کا دھیان اپنی بہن کی زندگی پر گیا تو اُسے محسوس ہوا کہ اُس کی زندگی میں بھی بہت سی دھوکا بازیاں ہیں۔ اُس نے اب عہد کیا کہ وہ اب وہی بن کر دکھائے گا، جو کچھ وہ ہے اور بناوٹی باتوں سے دُور رہے گا۔ اُس نے عہد کر لیا کہ اگر وہ

زندہ رہا تو بڑی نیک نیتی سے خدا کی تلاش کرے گا۔

وقت گذر رہا تھا۔ اب وہ کیا کرے؟ کیا جان بچانے کے لئے وہ چارلی کی نوکری کرے اور بعد میں جب بھی موقع ملے، یہاں سے فرار ہو جائے؟ نہیں۔ اگر میں نے ہاں کر دی تو پھر تو میں یہاں اتنا گہرا پھنس جاؤں گا کہ نکلنے کی کبھی کوئی صورت ہی پیدا نہ ہو سکے گی۔ ایک طرف تو وہ عہد کر رہا تھا کہ کسی صورت میں بھی چارلی کی نوکری نہ کرے گا لیکن دوسری طرف اُسے یہ خیال بھی آ رہا تھا کہ اگر وہ زندہ رہنا چاہتا ہے تو اُسے ہر صورت میں چارلی کی نوکری کرنے میں ہاں کرنا ہوگا۔

گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اسلم نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھا جس کے ہندسے اندھیرے میں چمکتے تھے۔ صبح کے چار بج رہے تھے۔ ہیں... یہ کیا!!! باہر کچھ کھٹکا سا ہوا۔ اسلم کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ کیا چارلی واپس آ گیا ہے؟ لیکن نہیں کوئی اُونچی آواز میں اُس کا نام پکار رہا تھا۔ پہلے تو وہ خاموش لیٹا رہا اور کوئی جواب نہ دیا۔ لیکن جب اُسے کوئی بار بار پکارتا تو اُس نے بھی ہمّت کی اور اُونچی آواز میں جواب دیا۔ اُس کے دل میں ایک نئی اُمید پیدا ہو رہی تھی۔ شاید اینڈی مدد لے کر آ گیا ہے۔ دیوار ٹٹولتا ٹٹولتا وہ دروازے کے قریب آ گیا اور کان لگا کر سننے لگا۔ لیکن ابھی باہر کی آوازیں بہت دور معلوم ہو رہی تھیں۔ کیا اینڈی مایوس ہو کر واپس تو نہیں مڑ رہا ہے؟ یہ خیال آتے ہی اُس نے پوری قوت سے چلانا شروع کر دیا۔

"مدد.... مدد.... میں یہاں ہوں"۔

باہر پھر کوئی بولا۔ اب وہ آواز نزدیک معلوم ہوتی تھی۔ اسلم خوشی سے دیوانہ ہوا جا رہا تھا اور زور زور سے سانس لے رہا تھا۔ اب وہ پورے

دھیان سے سُننے کی کوشش کر رہا تھا کہ باہر آواز کیسے دی جا رہی ہے۔
"اسکم ... لم ۔ لم ۔ لم ۔ لم" یہ اینڈی کی آواز تھی۔
"میں یہاں ہوں اینڈی ۔ ی ۔ ی ۔ ی" اُس نے پوری قوّت سے جواب دیا۔
اب کسی نے زور سے باہر کا تالہ ہلا کر کہا۔
"اسکم کیا تم اِس کمرے میں بند ہو؟"
"ہاں اینڈی ۔ میں یہاں ہی بند ہوں"۔
بند دروازے میں مُنہ لگا کر اینڈی بولا۔
"اب فکر نہ کرو ۔ پولیس نے چارلی اور اُس کے ساتھیوں کو گرفتار کر لیا ہے ۔ مَیں ابھی مدد لے کر آتا ہوں اور دروازہ توڑ کر تمہیں باہر نکالتا ہوں"۔
اینڈی واپس چلا گیا ۔ پھر ہر طرف خاموشی چھا گئی ۔ اسکم دل میں حیران ہونے لگا کہ وہ کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہا ۔ لیکن نہیں ۔ باہر تیزی سے قدم اُس کے کمرے کی طرف آتے سنائی دیئے ۔ پھر ہتھوڑے سے دروازے پر دو چار زبردست چوٹیں لگائی گئیں تو دروازہ بھڑاک سے کھُل گیا ۔ پولیس کے ایک افسر نے ٹارچ روشن کی ۔ اسکم لڑکیوں والے کپڑے پہنے دوڑتا ہوا سامنے آیا۔
"فکر مت کرو بیٹے ۔ ہم ٹھیک وقت پر یہاں تمہاری مدد کو آپہنچے ہیں"۔
افسر کے پیچھے چار اور سپاہی بھی کھڑے تھے۔
اینڈی جلدی سے لپک کر اپنے دوست سے لپٹ گیا۔

اب اسلم اپنے کپڑوں کی وجہ سے شرمانے لگا۔ افسر اور سپاہی بھی یہ دیکھ کر مسکرائے بغیر نہ رہ سکے کہ ایک لڑکا لڑکیوں والے کپڑے پہنے اُن کے سامنے کھڑا ہے۔ "تمہیں اتنی جلدی مدد کیسے مل گئی؟" اسلم نے اینڈی سے سوال کیا۔

"لنڈی کوتل تک سیدھا بھاگتا ہی گیا۔ تھانے پہنچ کر تو میں بس ختم ہی ہونے والا تھا۔ اتنی سانس چڑھی ہوئی تھی کہ میری زبان سے ایک لفظ نہ نکلتا تھا۔ لیکن جب میں نے انہیں ساری کہانی سنائی تو یہ صاحب ایک دم ہی یہاں پہنچ گئے۔" اینڈی نے پولیس افسر کی طرف بڑے فخر سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"چلو چلو اب یہاں سے باہر نکلو۔ تمہیں کیا اس جگہ سے پیار ہو گیا ہے جو یہاں سے ہلتے ہی نہیں۔ اور ہاں کاکی۔ اگر اس لڑکے نے تمہیں ساری کہانی سنانی شروع کر دی تب تو شاید عمر ہی یہاں گذر جائے۔ آؤ اب چلیں۔"

جب وہ لوگ تہہ خانے سے باہر آ رہے تھے تو اینڈی جلدی جلدی اسلم کو بتانے لگا "یہ حضرت چارلی بہت بڑا سمگلر ہے۔ یہ سب ملک میں سے موٹریں چرا کر یہاں لاتے ہیں اور پھر اُن کے پُرزے وغیرہ نکال لیتے ہیں۔ انجن بدل دیتے ہیں۔ اور اس ملک کی موٹریں دوسرے ملکوں میں اور وہاں کی موٹریں اس ملک میں بیچتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ ناجائز اسلحہ اور افیون چرس کی سمگلنگ بھی کرتے ہیں۔ تھانیدار اینڈی کی باتوں سے بڑا خوش ہو رہا تھا۔ جب وہ باہر نکلے تو اُس نے انہیں بہت سے لکڑی کے بکس دکھائے جو مختلف قسم کی بندوقوں اور پستولوں سے بھرے ہوئے تھے۔ اور خاص چمڑے کے تھیلوں میں کچھ بدبودار چیز بھی تھی۔ شاید وہ

چرس تھی۔

"اینڈی۔ اُس کاغذ پر کیا لکھا ہوا تھا؟"

تھانیدار نے جھٹ جواب دیا "میں بتاؤں۔ اُس کاغذ کی قیمت تو ہزاروں انسانوں کی جان سے بھی زیادہ ہے۔ وہ کاغذ نہیں تھا۔ دراصل ایک نقشہ تھا جس میں اُن تمام راستوں پر نشان لگائے تھے جہاں سے مختلف ممالک کو یہ سامان چوری چھپے بھیجا جاتا ہے۔ اُن پر اُن لوگوں کے نام اور پتے بھی درج ہیں جن کے پاس یہ مال جاتا تھا۔ ابھی تو ملک بھر میں اور بھی بہت سے شریف آدمی گرفتار کئے جائیں گے۔ اور یہ سب اُس کاغذ کی بدولت ہے۔"

"چارلی کا کیا ہوا؟" اسلم نے بڑی بے صبری سے پوچھا۔ کیونکہ اسلم پر اب بھی دہشت طاری تھی کہ وہ اُسے گولی مار دے گا۔

اینڈی نے قاتحانہ لہجہ میں کہا "ارے ہاں۔ اُسے گرفتار کر لیا گیا ہے۔ جب پولیس نے اس جگہ چھاپہ مارا تو وہ یہاں نہیں تھا۔ پہلے یہاں کے آدمی پکڑے گئے۔ پھر پولیس چھپ کر بیٹھ گئی۔ صبح ہی صبح جب چارلی صاحب آئے اور صحن میں داخل ہوئے تو چار سپاہیوں نے اُس کی کچی دبوچ لی اور اُسے ہتھکڑی پہنا دی۔"

پھر تھانیدار نے اسلم کو بتایا "چارلی کا اصل نام جانوس خان ہے۔ وہ پہلے سرکاری ملازم تھا اور پولیس کے خفیہ محکمے میں کام کرتا تھا۔ بڑا ہوشیار اور چالاک ہے اس لئے سرکاری نوکری چھوڑ دی اور یہ کام کرنے لگ گیا۔ ہمیں بڑی دیر سے شک تھا کہ اسلحہ کی سمگلنگ میں کسی بڑے ہوشیار آدمی کا ہاتھ ہے۔ لیکن ہم آج تک یہ راز حل کرنے میں

کامیاب نہ ہوئے تھے۔

اسلم نے ایک گہری سانس لی۔ اُسے یاد آیا کہ چارلی نے اُسے بھی بتایا تھا کہ وہ پولیس کے خفیہ محکمے کا ملازم ہے۔

اب وہ سب باہر صحن میں آ گئے تھے۔ دُور بہت دُور پہاڑوں کے پیچھے آسمان میں سُرخی نظر آ رہی تھی۔ دن نکلنے والا تھا۔ اسلم کی طرف تھانیدار نے دیکھ کر ذرا سر کھجلایا اور کھی کھی کھی کرتے ہوئے کہا "میری توبہ۔ ان بیگم صاحبہ کو تو ہم اِس طرح نہیں لے جا سکتے، اُن کے کپڑوں کے لئے تو کچھ کرنا ہی ہوگا"۔

اُسی وقت ایک سپاہی دوڑایا گیا اور تھانے میں جو بھی اسلم کے قد کا سپاہی تھا اُس کی شلوار اور قمیض اُسے لا کر دی گئی۔ اسلم اپنی سُرخ شلوار اور گلابی پھولدار قمیض اتار کر از حد خوش ہوا اور اب اُس نے مردوں والے کپڑے پہن لئے۔ تھانیدار نے دونوں لڑکوں کی پیٹھ ٹھونکتے ہوئے کہا "تم دونوں نے ایک بہت بڑا کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ اور بیت القمر کا راز فاش کر دیا ہے، جو ہم سے نہ ہو سکتا تھا۔ لیکن میرے بیٹو۔ آئندہ ایسا کام ہرگز ہرگز نہ کرنا۔ یہ کام بڑے خطرناک ہوتے ہیں"۔

دس بج چکے تھے۔ اب اسلم اور اینڈی نے تھانہ دار اور تھانے کے عملے سے رخصت چاہی۔ تھانیدار چاہتا تھا کہ جلد از جلد بیت القمر واپس جائے تاکہ جو بھی مال وہاں ہے اُس پر قبضہ کر لیا جائے اور جن جن آدمیوں کے نام پتے اُس نقشہ پر درج تھے اُن سب کو گرفتار کروا دیا جائے۔

اینڈی نے تھانیدار سے رضیہ کے بارے میں بھی کہہ دیا تھا۔ چونکہ اب چارلی کو ہتھکڑیاں پہنائی جا چکی تھیں اس لئے اب اُس کا سارا

غرور ختم ہو چکا تھا۔ رضیہ کے لئے بھی اُس نے صاف صاف بتا دیا کہ اُسے اپنے ایک رشتہ دار کے لئے اغوا کر کے لایا تھا۔ لیکن ابھی تک اُس کی شادی اُس دوست سے نہیں ہوئی تھی۔

ایک سپاہی دونوں لڑکوں کو بس سٹاپ تک چھوڑنے آیا۔ پشاور جانے والی بس تیار کھڑی تھی۔ فرنٹ سیٹ پر دونوں دوستوں کو بٹھا دیا گیا۔ اور بس تیزی سے خیبر کی پہاڑیوں سے نیچے کی طرف اُترنے لگی۔

اسلم اپنے دل میں خوش ہو رہا تھا کہ وہ واقعی اپنے گھر واپس جا رہا ہے۔ لیکن کبھی کبھی یہ سوچ کر پریشان بھی ہو جاتا کہ گھر والے اُس کے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔ کیا وہ اُس کے واپس آنے سے خوش ہوں گے؟

انڈی سمجھ گیا کہ اُس کا دوست کیا سوچ رہا تھا۔ اُس نے اُس کی طرف جھک کر کہا "اسلم۔ پنڈی پہنچ کر ہم ڈاک خانہ سے تمہارے گھر ٹیلیفون کر دیں گے۔ ہمارے پاس کافی وقت ہوگا۔ گاڑی تو شام کو چلتی ہے"۔

"ہاں دوست، یہ ٹھیک ہے۔ اِس طرح مجھے پتہ چل جائے گا کہ میرے بارے میں گھر والوں کا کیا خیال ہے۔ اگر تو وہ مجھ سے ناراض نہیں ہیں تو پنڈی سے لاہور تک میرا وقت اچھی طرح گذرے گا۔ اور اگر وہ ناراض ہوئے تو کم از کم میں سارا راستہ یہ تو سوچتا جاؤں گا کہ وہاں جا کر مجھے کس طرح اُن کا سامنا کرنا ہوگا"۔

دوپہر کو وہ پنڈی پہنچ گئے۔ دونوں سیدھے ڈاک خانہ گئے۔ جب اسلم انتظار کر رہا تھا کہ لاہور سے اُسے کال مل جائے تو وہ کافی پریشان اور گھبرایا دکھائی دیتا تھا۔ اتنے میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ ڈرتے ڈرتے اسلم نے فون کان سے لگایا اور تھرائی ہوئی آواز میں کہا "ابا جی ہیں؟۔۔۔ میں

میں اسلم بول..... بول رہا ہوں "۔

اُس کے ابّا نے بڑی اچھی طرح اُس سے بات کی اور پُورا پُورا یقین دلایا کہ وہ بے خوف و خطر واپس گھر آ جائے "بیٹا۔ پُرانی باتیں بھول جاؤ۔ ہم نے تمہاری غلطی معاف کر دی۔ ہم پر بڑے دُکھ کا وقت گذرا ہے۔ اور میں جانتا ہوں کہ تم نے بھی بہت مصیبتیں اُٹھائی ہیں۔ اب فوراً گھر واپس آ جاؤ۔ ہم سب تمہارے انتظار میں ہیں "۔

اسلم کی حیرانی کی کوئی حد نہ رہی۔ اب فون پر کوئی اور بول رہا تھا اور یہ اُس کی بہن ثریا کی آواز تھی "اوے اسلم زندہ باد۔ تم نے تو بہت بڑا معرکہ مارا ہے۔ ایک بہت ہی بڑا کام کیا ہے اور کس قدر خطرناک گروہ کو گرفتار کروا دیا ہے۔

لنڈی کوتل سے تھانیدار نے ہمیں ٹیلیفون کیا تھا اور تمہاری بہادری کی ساری داستان ہمیں سُنا دی تھی۔ ہاں۔ اخبار والوں نے ابھی تک تمہاری خبر شائع نہیں کی ہے وہ انتظار میں ہیں کہ تم یہاں آؤ تو وہ ہم سب کی تصویر اتاریں گے۔ اور تمہاری بہادری کی داستان موٹے موٹے حروف میں بیان کی جائے گی۔ اور ہم سب کی تصویر بھی اخبار میں نکلے گی۔ میرے پیارے بھائی مجھے تم پر بڑا ناز ہے۔ تم کتنے بہادر ہو۔ بس اب جتنی جلدی بھی ہو سکے گھر آ جاؤ "۔

"صبح ملاقات ہو گی۔ اچھا خدا حافظ"

اسلم نے فون بند کر دیا۔ اُس کے چہرے پر ایک مسکراہٹ تھی جو یہ ظاہر کرتی تھی "بس تجھے تو فخر ہی چاہیئے۔ میں تیری فطرت سے واقف ہوں۔ کہتی کچھ ہے کرتی کچھ ہے۔ تیری رائے ایک منٹ میں بنتی ہے اور ایک منٹ میں بگڑ جاتی ہے "۔

لیکن اپنے ابّو کی گفتگو سے اُسے بڑی تسلّی ملی تھی جو واقعی اب اس انتظار میں تھے کہ اُن کا کھویا ہوا بیٹا کب واپس گھر آتا ہے۔

گاڑی سیٹی بجا چکی تھی۔ اسلم بڑے جوش سے اپنے عزیز دوست اینڈی کے گلے لگا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے جُدا ہو رہے تھے۔ انہیں بڑا رنج تھا لیکن ساتھ ہی خوشی بھی اِس بات کی تھی کہ اب وہ دونوں زندگی میں ایک دوسرے کے بہترین دوست اور ساتھی بن چکے ہیں۔ گاڑی چل دی۔ اسلم دیر تک باہر کھڑے اینڈی کو دیکھتا رہا۔ اینڈی جو اُس کی زندگی کا ساتھی تھا۔

خلا میں کھڑکی سے جھانکتے ہوتے اسلم سوچ رہا تھا "زندگی"....

مجھے تو زندہ رہنے کے لئے یہ دوسرا موقع عطا فرمایا گیا ہے۔ اب میں سوچ سمجھ کے اپنی زندگی گذاروں گا۔ سب سے پہلا کام جو میں اپنی زندگی میں کروں گا، وہ یہ ہوگا کہ میں خُدا کو ڈھونڈوں گا۔

اینڈی نے کہا تھا کہ اگر کوئی سچے دل سے خُدا کو تلاش کرے تو وہ اپنے آپ کو اس پر ظاہر کرے گا۔ اب میں آزما کر دیکھوں گا کہ اس کی یہ بات درست ہے کہ نہیں۔"

تمام شد